قرآن وسنت اور اسلاف امت کی تعلیمات کا داعی
دینی، علمی، ادبی، تحقیقی اور اصلاحی مضامین کا حامل

مجلّہ صدائے حق بنگلور

سرپرست

حضرت مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری زیدت معالیھم
استاذ حدیث ومدیر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند

مدیر
عبدالرزاق بنگلوری

نائب مدیر
مفتی عبدالرحمٰن بنگلوری

ناشر
مجلس، صدائے حق اسلامک پورٹل بنگلور-78

قرآن وسنت اور اسلافِ امت کی تعلیمات کا داعی

دینی، علمی، ادبی، تحقیقی اور اصلاحی مضامین کا حامل

مجلّہ

صدائے حق بنگلور

جلد:۰۲	شمارہ:۱۳	ماہ جولائی ۲۰۲۲ء	ماہ ذی الحجہ ۱۴۴۳ھ

سرپرست

حضرت مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری دامت برکاتہم

استاذِ حدیث و مدیر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند

مدیر	نائب مدیر
عبدالرزاق بنگلوری	مفتی عبدالرحمٰن صاحب بنگلوری

مجلس ادارت

مفتی محمد علی صاحب قاسمی

مولانا محمد اُویس صاحب رشادی

مولانا عبداللطیف صاحب قاسمی

مجلسِ مشاورت

مولانا اشرف صاحب قاسمی

مولانا عبدالقدوس صاحب مظاہری

مفتی عبدالفتاح صاحب قاسمی

ADVERTISEMENT TARIFF

Full Page (Title Back Cover)	6000/-
Full Page (Title Inner Cover)	5000/-

Black and White

Full Page (Inside Pages)	2000/-
Half Page (Inside Pages)	1000/-
Cuarter Page (Inside Pages)	500/-

Phone Pe & Google Pay:7406464533

مضمون نگار کی آرا سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں

شائع کردہ

مجلس: صدائے حق اسلامک پورٹل بنگلور 78

فہرست مضامین

عناوین	مضامین	اسمائے محررین	صفحہ نمبر
اداریہ	عیدِ قرباں ایک سبق آموز تہوار	عبدالرزاق بنگلوری	۳
درسِ قرآن	درس سورۂ بقرہ (قسط اوّل)	مفتی محمد سلمان صاحب منصور پوری	۶
درسِ حدیث	علمِ دین کی اہمیت	مفتی عبدالرحمٰن صاحب بنگلوری	۱۳
سیرتِ نبویؐ	اپنی جان اور اپنی اولاد سے بڑھ کر	مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی	۱۶
اصلاحِ معاشرہ	ماں کی ممتا	مفتی محمد عفان صاحب منصور پوری	۲۰
// // //	نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ و بالا	مفتی محمد اسجد صاحب ندوی قاسمی	۲۶
// // //	سال گرہ کا فتنہ عروج پر، معاشرہ کی اصلاح وقت کی اہم ترین ضرورت	مولانا عبدالقدوس صاحب مظاہری	۳۱
// // //	آثارِ قیامت (قسط دوم)	مفتی عبدالغفار صاحب بنگلوری	۳۴
تذکرۂ اولیاءؒ	بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا	مولانا محمد عمرین محفوظ رحمانی صاحب	۳۷

اطلاعِ عام

نوٹ: مضمون نگار اپنے مضامین مندرجہ ذیل ای میل (E-mail) یا واٹسیپ (WhatsApp) پر ان پیج (InPage) فائل روانہ کر سکتے ہیں، جزاکم اللہ خیراً و أحسن الجزاء.

Email: muftiabdurrahman57@gmail.com
Whatsapp No: 09620795460 - 9739349433

اداریہ

عیدقرباں ایک سبق آموز تہوار

از:عبدالرزاق بنگلوری

دنیا بھر میں پُرانی قوموں سے یہ دستور رہا ہے کہ عیدِ قرباں کے دن جانوروں کے خون بہانے کو تقرب کا ذریعہ سمجھا گیا، اور حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کے واقعہ میں اللہ کی رضاجوئی کی خاطر جنتی مینڈھے کی قربانی کروا کر عملاً اس دستور کو صحیح رُخ دے دیا گیا اور اسلام میں بھی یہ طریقہ نہ صرف یہ کہ مشروع؛ بلکہ مطلوب ومحمود قرار پایا اور وسعت والوں پر خاص دنوں میں متعینہ جانوروں میں سے قربانی پیش کر کے تقربِ خداوندی کے حصول کو واجب قرار دیا گیا اور اس پر اتنی تاکید کی گئی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت تنبیہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:"**من وجد سعة لأن يضحي فلم يضحي فلايحضر مصلانا**". (الترغیب والترہیب مکمل:۲۵۶) جو آدمی قربانی کی گنجائش رکھنے کے باوجود قربانی نہ کرے وہ ہماری عیدگاہ میں نہ آئے۔

قربانی کے ایام میں دیگر عبادات کے مقابلے میں قربانی کا عمل اللہ کو سب سے زیادہ پسند ہے۔

فضائلِ قربانی:

اُمّ المؤمنین سیّدتنا عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: قربانی کے دن میں کوئی عمل اللہ تعالیٰ کو خون بہانے (جانوروں کی قربانی کرنے) سے زیادہ پسندیدہ نہیں ہے، اور یہ قربانی کا جانور قیامت کے میدان میں اپنے سینگوں، بالوں اور کھروں کے ساتھ آئے گا اور قربانی میں بہایا جانے والا خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے دربار میں قبولیت کا مقام حاصل کر لیتا ہے؛ لہٰذا خوش دلی سے قربانی کیا کرو۔ (ترمذی شریف:۱۴۹۳)

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اصحاب نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ان قربانیوں کی کیا حقیقت اور کیا تاریخ ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ تمہارے (روحانی اور نسلی) مورث حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے، یعنی سب سے پہلے ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا حکم دیا گیا اور وہ کیا کرتے تھے، ان کی اس سنت اور قربانی کے اس عمل کی پیروی کا حکم مجھ کو اور میری امت کو بھی دیا گیا ہے، ان صحابی نے عرض کیا پھر ہمارے لیے یارسول اللہ! ان قربانیوں میں کیا اجر ہے؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قربانی کے جانور کے ہر ہر بال کے عوض ایک نیکی، انھوں نے عرض کیا تو کیا اُون کا بھی یا رسول اللہ! یہی حساب ہے؟ اس سوال کا مطلب تھا کہ بھیڑ، دنبہ، مینڈھا، اونٹ جیسے جانور جن کی کھال پر گائے، بیل یا بکری کی طرح کے بال نہیں ہوتے؛ بلکہ اُون ہوتا ہے اور یقیناً اُن میں سے ایک ایک جانور کی کھال پر لاکھوں یا کروڑوں بال ہوتے ہیں تو کیا ان اُون والے جانوروں کی قربانی کا ثواب بھی ہر بال کے عوض ایک نیکی ملے گی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں! اُون والے جانور کی قربانی کا اجر بھی اسی طرح اور اسی حساب سے ملے گا کہ اس کے بھی ہر بال کے عوض ایک نیکی ہے۔ (مسند احمد، سنن ابنِ ماجہ، مشکوٰۃ، الترغیب)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں دس سال قیام فرمایا اور آپؐ برابر (ہر سال) قربانی کرتے رہے۔ (جامع ترمذی)

حنش بن عبداللہ سے روایت ہے کہ مَیں نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو دو مینڈھوں کی قربانی کرتے دیکھا تو مَیں نے ان سے عرض کیا کہ یہ کیا ہے یعنی آپ ایک کی بجائے دو مینڈھوں کی قربانی کیوں کرتے ہیں؟ انھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے وصیت فرمائی تھی کہ مَیں آپ کی طرف سے بھی قربانی کیا کروں تو ایک قربانی مَیں آپؐ کی جانب سے کرتا ہوں۔ (سنن ابی داؤد، جامع ترمذی)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ جو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص تھے، وہ اپنا اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول بقرعید کے دن کا بیان فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دو مینڈھوں کی قربانی کا کیا کرتے تھے اور مَیں بھی دو مینڈھوں کی قربانی کرتا ہوں۔ (بخاری)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بقرعید کے دن سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک قربانی کرنا تھا، حضرت انس رضی اللہ عنہ کا معمول بھی سنتِ نبی کے مطابق قربانی کرنا تھا؛ بلکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے تو محبتِ نبی میں ڈوبی ہوئی ایک اور بات بھی فرمادی کہ چونکہ میرے آقا اور محبوب کا معمول بھی دو مینڈھے قربان کرنا تھا، مَیں نے بھی ادائے رسولؐ کی پیروی اپنا معمول بنالیا تھا۔

قربانی کا اصل مقصد رضائے الٰہی کا حصول اور شیطانی طاقتوں کو پوری طرح مسمار کرنا ہے، اسی سے روح کو تقویت ملتی ہے اور تقویٰ پروان چڑھتا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کو جانور کا گوشت اور جانور کا خون ہرگز نہیں پہنچتا؛ بلکہ تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔ (سورۂ حج: ۳۷)

اس سے معلوم ہوا کہ کسی کی قربانی کبھی رائیگاں نہیں جاتی، جبکہ اس میں اخلاص ہو، اس کا اجر سو فیصد یقینی ہے، یہ ایک مقدس عبادت ہے، جسے اللہ نے ہر صاحبِ نصاب پر لازم قرار دیا ہے، یہ اسلامی تعلیمات کا اہم ترین

حصہ ہے، جس سے اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل کی جاسکتی ہے، اس اچھے اور سچے عمل کے ذریعہ سے خون بہا کر گوشت حاصل کرنا مقصود نہیں ہے؛ بلکہ اپنے ایمان اور تقویٰ کو مستحکم بنانا مقصود ہے، اللہ تعالیٰ کو خون اور گوشت کی قطعاً ضرورت نہیں ہے،، اُسے ضرورت ہے اپنی نیک نیت اور خلوص کی۔

حرفِ آخر:

آج کل مالدار یہ چاہتا ہے کہ میرا قربانی کا جانور مہنگا اور بہترین ہو، بالآخر وہ جانور کو خریدنے کے لیے لاکھوں روپئے خرچ کر دیتا ہے؛ تاکہ محلّہ اور شہر میں میرا نام اور میری شہرت ہو، تو ایسے لوگوں کی قربانی محض دکھلاوا بن کر رہ جائے گی، یہاں کسی کو دکھانا مقصود نہیں ہے؛ بلکہ اللہ کے یہاں ہماری قربانی کو قبول کروانا مقصود ہے، فضول خرچی سے تو ہر جگہ اجتناب کرنا لازم ہے، اللہ تعالیٰ ہم تمام کی قربانیوں کو قبول فرمائے، اسراف اور فضول خرچی سے حفاظت فرمائے۔ (آمین)

درسِ قرآن
قسط اوّل

درس سورۂ بقرہ

ازقلم: حضرت مولانا مفتی سیّد محمد سلمان صاحب منصور پوری، استاذِ حدیث وفقہ دارالعلوم دیوبند

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

﴿الٓمّٓ ○ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَارَيْبَ فِيْهِ، هُدىً لِّلْمُتَّقِيْنَ ○ اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ، وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدىً مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○﴾

الٓمّٓ ○ اِس کتاب میں کوئی شک نہیں، یہ متقین کے لیے رہنما ہے۔ جو بے دیکھی چیزوں پر یقین کرتے ہیں ○ اور نماز کو قائم رکھتے ہیں، اور ہماری دی ہوئی روزی میں سے (کارِ خیر میں) خرچ کرتے ہیں ○ اور وہ لوگ جو آپ پر نازل شدہ (وحی اور قرآنِ مقدس) اور آپ سے پہلے (اَنبیاء سابقین پر) نازل کردہ (کتابوں) پر اِیمان لاتے ہیں، اور آخرت کو یقینی جانتے ہیں ○ وہی اپنی رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں، اور وہی (درحقیقت) فلاح یاب ہیں ○

محترم بھائیو اور بزرگو! اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو شریعت ہمیں عطا فرمائی ہے، وہ قیامت تک باقی رہنے والی ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے اُس کی بقا کا انتظام اِس طرح فرمایا کہ ہمیں اپنی کتاب (قرآنِ مقدس) عطا کرنے کے بعد یہ نہیں کہا کہ تم اِس کتاب کی حفاظت کی ذمہ داری اُٹھانا؛ بلکہ یہ فرمایا کہ: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ [الحجر: ٩] (یعنی ہم نے ہی یہ نصیحت آمیز کتاب اُتاری ہے اور ہم خود ہی اُس کی حفاظت کرنے والے ہیں)

تو ظاہر ہے کہ خود اللہ تعالیٰ جس کا محافظ ہو جائے اُس کو کون مٹا سکتا ہے؟ کسی شاعر نے سچ کہا ہے:

فانوس بن کے جس کی حفاظت ''ہَوا'' کرے
وہ شمع کیا بجھے جسے روشن ''خدا'' کرے

لہٰذا قرآن باقی ہے اور باقی رہے گا، اور اُسی کے ساتھ دین محمدی بھی باقی ہے اور باقی رہے گا۔

پس جب تک قرآن پڑھا اور سنا جاتا رہے گا، اور اُسے سمجھ کر دل میں اُتارا جاتا رہے گا، تو اِن شاء اللہ دین زندہ رہے گا۔

قرآنِ کریم جس گھر میں پڑھا جائے گا اُس گھر میں دین رہے گا۔

جس محلے میں پڑھا جائے گا اُس محلے میں دین رہے گا۔

جس معاشرہ میں پڑھا جائے گا اُس معاشرے میں دین رہے گا۔

اور جس علاقے میں پڑھا جائے گا اُس علاقے میں دین رہے گا۔

گویا کہ قرآنِ کریم دینِ محمدی کی بقا کی سب سے بڑی ضمانت ہے، جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے اُمت محمدیہ کو عطا فرمائی ہے۔

اِسی طرح یقیناً وہ لوگ بہت خوش نصیب ہیں جو قرآنِ پاک کو پڑھتے ہیں، سنتے ہیں اور سمجھنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔

لہٰذا خاص طور پر مساجد کے اندر ایسا نظام ہونا چاہیے کہ ہم نماز میں جو قرآن پڑھ رہے ہیں، اُس کے معانی سے بھی ہم آگاہ ہوں؛ تاکہ ہمیں پتہ چلے کہ قرآنِ کریم ہم سے کیا کہہ رہا ہے؟

بلاشبہ قرآن کو بلا سمجھے پڑھنے کا بھی بڑا ثواب ہے، اُس کے ہر ہر حرف پر ۱۰-۱۰ نیکیاں ملتی ہیں؛ لیکن اگر سمجھ کر پڑھا جائے، تو پھر ''نورٌ علیٰ نور'' اور ''سونے پر سہاگہ'' ہے۔

جو بھی قرآنِ پاک کو سمجھ کر پڑھے گا، وہ ضرور اِس نتیجے پر پہنچے گا کہ قرآنِ کریم میں بیان کردہ مضامین بڑے مضبوط اور لوہا لاٹ ہیں، اُن کا مطالعہ کرنے سے دلوں کے اندر سے کفر وشرک اور دیگر ضلالتوں کے جراثیم بالکل مٹ جاتے ہیں۔

قرآنِ کریم آدمی کو اَندھیرے سے نکال کر روشنی میں لاکر کھڑا کر دیتا ہے۔

قرآنِ کریم شرک وبدعت کے دلدل سے نکال کر توحید کی مضبوط چٹان پر قائم کر دیتا ہے۔

لہٰذا قرآنِ کریم سے وابستگی ہماری ضرورت ہے، اور سعادت کی بات ہے۔

اگر ہم نے اپنی زندگی میں قرآنِ کریم کو اُتار لیا اور اُس کی پیروی اختیار کر لی، تو کبھی بھی اور کہیں بھی ناکام نہیں رہیں گے، اور دنیا اور آخرت میں ہمیں پُرسکون زندگی نصیب ہوگی، اِن شاء اللہ تعالیٰ۔

ختم قرآن کے بعد دوبارہ شروع کرنا

مفسر قرآن سیدنا حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ ایک شخص نے نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سوال کیا کہ ''اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ کون سا عمل پسند ہے؟'' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

اِرشادفرمایا: ''اَلْحَالُّ الْمُرْتَحِلُ'' تو اُس شخص نے پوچھا کہ اِس لفظ کا کیا مطلب ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اَلَّذِيْ يَضْرِبُ مِنْ أَوَّلِ الْقُرْآنِ إِلىٰ آخِرِهٖ كُلَّمَا حَلَ اِرْتَحَلَ''. (سنن الترمذي، أبواب القراءات رقم: ۲۹۴۸) (یعنی وہ شخص جو شروع سے اخیر تک قرآنِ کریم پڑھتا ہے اور ختم کرنے کے بعد دوبارہ شروع کردیتا ہے)

گویا کہ پیغمبر علیہ السلام نے اِس طرح کا عمل کرنے والے کو ایسے شخص سے تشبیہ دی ہے، جو کسی دینی مہم سے واپس لوٹے اور پھر فوراً اگلے سفر کی تیاری شروع کردے۔

اِسی بنا پر حفاظِ کرام کا یہ معمول ہے کہ ختم قرآن کے بعد سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات ﴿مُفْلِحُوْنَ﴾ تک پڑھتے ہیں۔

اور اِس میں ایک نیک فالی بھی ہے کہ ایک ختم کیا اور دوسرا شروع کردیا، تو جب شروع کردیا تو اُس کو ختم کرنے کی فکر بھی ہوگی، اور اللہ تعالیٰ توفیق سے نوازیں گے، اور یہ سلسلہ برابر جاری رہے گا؛ چناں چہ اِسی مناسبت سے آپ کے سامنے مذکورہ آیات کی تلاوت کی گئی ہے، اور اُنہیں کے متعلق چند باتیں عرض کرنے کا اِرادہ ہے۔

سورۂ بقرہ

''سورۂ بقرہ'' قرآنِ کریم کی سب سے لمبی سورت ہے اور موجودہ ترتیب میں ''سورۂ فاتحہ'' کے بعد اِسی کا نمبر ہے، یہ سورت ۲۸۶ آیتوں اور تقریباً ڈھائی پارے پر مشتمل ہے، اور اِس کا شمار مدنی سورتوں میں ہے۔

نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اِرشاد فرمایا کہ: ''جو لوگ سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کو یاد کرکے پڑھنے والے اور اُن پر عمل کرنے والے ہوں گے، وہ میدانِ حشر میں اِس حالت میں آئیں گے کہ اُن کی رہنمائی اور قیادت یہ دونوں سورتیں کررہی ہوں گی۔

اور فرمایا کہ اِس کی تین مثالیں ہیں، جیسے کوئی سائبان ہو، یا جیسے کوئی بادل کا ٹکڑا ہو، یا فضا کے اندر صف بستہ اُڑنے والے پرندے ہوں، جن کا سایہ زمین پر پڑتا ہو، اِسی طرح یہ سورتیں اپنے پڑھنے والوں پر سائبان بن کر چلیں گی''۔ (صحیح مسلم ۸۰۴، سنن الترمذی/ باب ماجاء فی سورۃ آل عمران ۲/۱۱۱۶ اشرفیہ دیوبند، مصنف عبدالرزاق رقم: ۵۹۱۱، المسند للامام احمد ۵/۲۴۹-۲۵۴ بحوالۃ: تفسیر ابن کثیر ۱/۱۴۳ زکریا)

ایک روایت میں ہے کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک لشکر بھیجنے کا اِرادہ فرمایا، اور لشکر کے اَمیر کے

انتخاب کے لیے آپ نے حاضرین کا جائزہ لینا شروع کیا، آپ ہر ایک کو بلا کر یہ پوچھنے لگے کہ تمہیں قرانِ پاک کی کون کون سی سورتیں یاد ہیں؟

کسی نے دو سورتیں، کسی نے تین سورتیں بتلائیں۔

اِسی دوران ایک نوجوان لڑکا جو حاضرین میں شامل تھا، حضرت نے اُس سے پوچھا، ''تمہیں کیا یاد ہے؟''

اُس نے کہا مجھے فلاں فلاں سورت یاد ہے، اور سورۂ بقرہ بھی یاد ہے۔

حضور نے فرمایا کہ: ''اچھا! تمہیں پوری سورۂ بقرہ یاد ہے؟

لہٰذا تم ہی امیر ہو، جھنڈا تمہارے ہاتھ میں ہے''۔

اُس نوجوان کو جب یہ جھنڈا مل گیا، تو اُس جماعت میں ایک عمر دراز اور برادری کے باوقار آدمی بھی تھے (اُن کو ذرا احساس ہوا کہ ہم پیچھے رہ گئے، اور اِس نوجوان کو جھنڈا مل گیا) تو اُنہوں نے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں حاضر ہوکر معذرت کی کہ ہم نے تو ''سورۂ بقرہ'' اِس خطرہ سے یاد نہیں کی کہ بعد میں کہیں ہم بھول نہ جائیں۔

تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِرشاد فرمایا کہ:

''قرآن پڑھو اور قرآن پڑھاؤ، جو پڑھے گا اور سیکھے گا اور اُس کے بعد تلاوت کرے گا، اُس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ مشک سے بھری ہوئی ڈبیا کو کھول دیا جائے، اور سارے مجمع میں خوشبو پھیل جائے اور جو پڑھ لے گا؛ مگر زیادہ تلاوت اور یاد کرنے کا اہتمام نہ رکھے گا تو اُس کی مثال ایسی ہے جیسے مشک کی ڈبیا ہو مگر بند ہو''۔

(سنن الترمذی/ باب ماجاء فی فضل سورۃ البقرۃ ۲/۱۱۹ المکتبۃ الاشرفیۃ دیوبند)

تو معلوم ہوا کہ قرآنِ کریم پڑھنا کسی بھی حال میں فائدہ سے خالی نہیں ہے؛ لہٰذا یہ سوچ کر کہ بعد میں کہیں بھول نہ جائیں، قرآن سیکھنے میں سستی کرنا ٹھیک نہیں ہے۔

پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا کہ: ''اپنے گھروں کو قبرستان مت بناؤ (یعنی وہاں عبادت اور تلاوت کا سلسلہ جاری رکھو، اور وہاں قبرستانوں کی طرح سناٹا نہیں ہونا چاہیے) اور جس گھر میں سورۂ بقرہ پڑھی جاتی ہے، وہاں شیاطین اور آسیب وغیرہ کا اثر نہیں ہوتا''۔ (ترمذی شریف، ابواب فضائل القرآن/ باب ماجاء فی سورۃ البقرۃ وآیۃ الکرسی ۲/۱۱۵)

تو معلوم ہوا کہ یہ سورت اپنے اندر بہت فضیلت رکھتی ہے، اور خاص طور پر اِس کی ابتدائی اور آخری آیات نیز ''آیۃ الکرسی'' کو بڑی فضیلت حاصل ہے، جسے تمام آیتوں کی سردار قرار دیا گیا ہے۔ (ترمذی شریف ۲/۱۱۵)

حروفِ مقطعات

سورۂ بقرہ کا آغاز حروفِ مقطعات یعنی ''الٓمٓ'' سے کیا گیا ہے، جس کے معنی صرف اللہ تعالیٰ کو معلوم ہیں،

اِن کو پڑھنے پر حسب دستور کم اَز کم ۳۰ نیکیوں کا ثواب تو ملے گا؛ کیوں کہ یہ تین حروف پر مشتمل ہے؛ لیکن اِن سے اللہ تعالیٰ نے کیا مراد لیا ہے؟ ہمارا ناقص علم اُس کو سمجھنے سے قاصر ہے؛ لہٰذا اِن حروف کو پڑھتے ہوئے اپنی عاجزی کا اظہار کرنا ہے۔ اور بلا کسی تفصیل کے اُن پر ایمان لانا ہے۔

کتابِ مقدس

''سورۂ فاتحہ'' میں صراطِ مستقیم کی طلب کی گئی تھی، تو اُس درخواست کی تکمیل؛ گویا کہ اِس اِرشادِ عالی سے ہورہی ہے کہ ﴿ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ﴾ یعنی صراطِ مستقیم یہی قرآنِ مقدس ہے، جس کے کلامِ الٰہی ہونے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

کوئی یہ نہ کہے کہ اِسے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی طرف سے بنا کر پیش فرمایا ہے؛ بلکہ یہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل فرمودہ کتاب ہے، اُس کے اَلفاظ اور معانی سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل فرمودہ ہیں، اُن میں کسی کو اَدنیٰ درجہ کا بھی شک نہیں ہونا چاہیے۔

آج قرآنِ مقدس کے علاوہ کسی بھی کتاب کے بارے میں حقیقۃً منزّل من اللہ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔

یہود ونصاریٰ آج کی مزعومہ ''توریت'' یا ''انجیل'' کے بارے میں خدائی کتاب ہونے کا جو دعویٰ کرتے ہیں، وہ اُس کے متعلق کوئی معتبر دلیل پیش نہیں کرسکتے؛ اِس لیے کہ اُن کتابوں کے نزول کے زمانے سے لے کر آج تک اعتماد واعتبار کا تسلسل برقرار نہیں ہے۔ درمیانی صدیوں میں اُن کتابوں میں کیسی کیسی تحریفات اور تبدیلیاں کی گئیں، خود اُن کے پاس بھی اِس کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ اُن کے دنیادار اور مفاد پرست مذہبی رہنماؤں نے رشوتیں لے کر احکامات بدل ڈالے، اور سب سے بڑی بات تو یہ ہوئی کہ جس زبان میں اُن کتابوں کا نزول ہوا تھا، اُس کی پاس داری بھی نہ کی جاسکی، اور اصل زبان کو نظر انداز کرکے اُن کتابوں کے دیگر زبانوں میں ترجمے کردیے گئے، اور اُنہی تراجم کو اصل مان لیا گیا، جس کی بنا پر پوری کتابیں ہی غیر معتبر ہوگئیں۔

اِس کے برخلاف قرآنِ پاک کا کمال یہ ہے کہ وہ جس فصیح ترین عربی زبان میں نازل ہوا تھا، آج اُسی زبان میں پوری دنیا میں پڑھا اور لکھا جاتا ہے۔ کیا عرب کیا عجم؟ کیا مشرق کیا مغرب؟ کیا شمال کیا جنوب؟ پورے عالم کے رہنے والے مسلمان سب دورِ نبوت سے آج تک ایک ہی قرآن پڑھتے ہیں۔

بہت سے عجمی لوگوں کا حال یہ ہے کہ اگر قرآن کے علاوہ کوئی اور عربی کتاب اُن کے سامنے رکھ دی جائے، تو وہ ایک لائن بھی نہ پڑھ پائیں؛ لیکن کتنا ہی گیا گزرا مسلمان کیوں نہ ہو، اور کہیں کا بھی رہنے والا ہو؟ وہ قرآن

تو کچھ نہ کچھ پڑھ ہی لیتا ہے، اور اُسی زبان میں پڑھتا ہے جس میں اُس کا نزول ہوا ہے، اور بہترین انداز میں پڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ فالحمدللہ علیٰ ذلک۔

بہت سے لوگ جن کی مادری زبان عربی نہیں ہے؛ مگر جب وہ قرآنِ کریم کی تلاوت کرتے ہیں تو عرب حضرات بھی عش عش کر اُٹھتے ہیں۔

ایک یادگار تلاوت

کئی سال قبل وسطی اَمریکہ کے ایک ملک (ٹرینی ڈاڈ) میں ہمارا جانا ہوا، وہاں انگریزی بولی جاتی ہے۔ تو ایک مسجد میں ایک حبشی النسل جوان نے عشاء میں ایسی شاندار تلاوت کی کہ جی چاہ رہا تھا کہ بس وہ پڑھتا ہی رہے، آج تک اُس کی چاشنی دل ودماغ میں محفوظ ہے۔ اَب دیکھیے کہ حجاز مقدس سے ہزاروں میل دُور رہنے والا، اور انگریزی زبان بولنے والا جب تجوید اور حسنِ اَدا کے ساتھ قرآن پڑھتا ہے تو سننے والے سر دُھنتے ہیں، تو یہ قرآن کا اعجاز نہیں تو اور کیا ہے؟

ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآنِ کریم کی حقانیت کے لیے تو یہی ایک دلیل کافی ہے کہ وہ اپنی اصل زبان اور لہجے میں موجود اور محفوظ ہے۔ اور اُس کے ۳۰/ پارے چھوٹے چھوٹے بچے اپنے سینوں میں محفوظ کر رہے ہیں، قرآن کے علاوہ اِس کی کہیں اور مثال نہیں مل سکتی۔

پھر اُس کے معانی بھی بے مثال اور لاجواب ہیں، اور اُس میں پرانی قوموں کے واقعات اور آخرت کی منظر کشی بھی جا بجا کی گئی ہیں، اِن باتوں کا نبی اُمی، سرعالم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اِظہار؛ یہ بھی اُس کے برحق ہونے کی کھلی دلیل ہے۔ اِس میں ذرہ برابر کسی کو شک نہیں ہونا چاہیے۔

اور چوں کہ جب تک کلامِ الٰہی کے برحق ہونے کا دل میں یقین نہ ہو، اُس وقت تک اُسے پڑھنے کا پورا فائدہ بھی نہیں ہوسکتا؛ اِس لیے سورۂ بقرہ کی ابتداء اِسی حقیقت کے اعلان سے کی گئی ہے۔

اَب نہ اُتریں گے صحیفے اَب نہ آئیں گے رسول
لے کے قرآں آخری پیغامبر پیدا ہوئے

متقی کر کتاب

اُس کے بعد فرمایا گیا: ﴿هُدىً لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ (یعنی یہ کتاب تقویٰ والوں کے لیے ذریعۂ ہدایت ہے)

اِس پر یہ اشکال ہوسکتا ہے کہ تقویٰ والے تو پہلے ہی متقی ہیں، پھر اُن کو ہدایت کی کیا ضرورت ہے؟ کیوں کہ ہدایت یافتہ ہوئے بغیر متقی ہونے کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا؟

تو اِس اِشکال کا جواب دو طرح سے دیا گیا ہے:

الف:- آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب آدمی کو متقی بنانے والی ہے، یعنی جسے متقی بننا ہو وہ قرآن کو اپنا رہبر بنائے؛ گویا کہ تقویٰ کی طرف رہنمائی کرنے والی کتاب ہے۔

ب:- اور دوسرا مطلب یہ بیان کیا گیا کہ یہ متقیوں کو تقویٰ پر قائم رکھنے والی کتاب ہے؛ گویا کہ متقی حضرات اُسی وقت تک متقی رہیں گے، جب کہ وہ قرآن کو اپنا رہبر بنا کر زندگی گزاریں گے۔ یا یوں کہیے کہ یہ تقویٰ پر جمانے والی کتاب ہے۔

(جاری).....

درسِ حدیث

علمِ دین کی اہمیت

ازقلم: مفتی عبدالرحمٰن صاحب بنگلوری، ناظم مدرسہ دارالتوحید، اعلیٰ ہلی بنگلور

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ''مَنْ سَلَكَ طَرِيْقًا يَلْتَمِسُ فِيْهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللّٰهُ لَهُ طَرِيْقًا إِلَى الْجَنَّةِ''. قَالَ أَبُوْعِيْسٰى: هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ.

(رواه الترمذي:١٣٨٨)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جوعلم حاصل کرنے کے ارادہ سے کہیں جائے، تو اللہ اس کے لیے جنت کے راستے کو آسان (وہموار) کردیتا ہے''۔

تشریح:

اس حدیث سے علم کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، معلوم ہوا کہ علم کے حصول کے لیے سفر کرنا مستحب ہے، موسیٰ علیہ السلام نے خضر علیہ السلام کے ساتھ علم حاصل کرنے کے لیے سفر کیا، اور عبداللہ بن قیس رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث کے علم کے لیے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے ایک مہینہ کا سفر طے کیا، علماءِ سلف حدیث کی طلب میں دُور دراز کا سفر کرتے تھے، اگر خلوصِ نیت کیساتھ علمِ شرعی کے حصول کی کوشش کی جائے تو اللہ رب العالمین جنت کا راستہ آسان کردیتا ہے۔

طلبِ علم کے بعض فضائل کی توضیح وتشریح کے ضمن میں یہ حدیث وارد ہوئی ہے: ان فضائل میں سب سے پہلی فضیلت یہ ہے کہ جوشخص کسی راہ پر نکل پڑے اور اس راہ پر نکلنے کا مقصد محض طلبِ علم یا علم کی تحقیق ہو؛ چاہے وہ طالبِ علم گھر ہی میں کیوں نہ ہو، اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اسے طلبِ علم کا بدلہ عنایت فرمائے گا۔ یعنی اس کے لیے جنت کی راہ آسان کردے گا۔ علمی راہ اپنانے میں جس طرح حسی راستہ شامل ہے، جس میں انسان اپنے قدموں کے ذریعے چل کر جاتا ہے، اسی طرح اس میں معنوی راستہ بھی شامل ہے۔ مثلاً انسان علماء کی مجالس اور کتابی ذخیروں سے علم حاصل کرے؛ کیونکہ جوشخص کسی شرعی مسئلے کا حکم جاننے کی غرض سے کتابوں کی تحقیق ومراجعہ کرتا ہے یا کسی شیخ کی مجلس میں بیٹھ کر اس سے استفادہ کرتا ہے، وہ بھی طلبِ علم کی راہ طے کررہا ہوتا ہے، گرچہ وہ بیٹھا ہوا ہی کیوں نہ ہو۔

اس حدیث میں مذکور فضائل میں سے یہ بھی ہیکہ آسمان وزمین کی ساری مخلوقات یہاں تک کہ سمندر میں موجود مچھلیاں اور خشکی میں پائے جانے والے چوپائے بھی ان علماء کے حق میں مغفرت طلب کرتے رہتے ہیں۔

طلبِ علم کے فضائل میں یہ بھی ہے کہ اللہ عزوجل کی مکرم ومعزز مخلوق فرشتے بھی طالبِ علم کو علمی مشاغل میں مصروف دیکھتے ہوئے خوشی سے علم اور اہلِ علم کے روبرو اپنی فروتنی اور ان کی عظمت کے اعتراف میں اپنے پنکھ بچھادیتے ہیں۔اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کردہ فضائل میں سے یہ بھی ہے کہ علماء انبیاءؑ کے وارث وجانشین ہوتے ہیں۔ یہ اِس طرح سے کہ انھیں انبیاءؑ سے علم اور عمل کی دولت وراثت میں حاصل ہوئی؛ نیز دعوت الی اللہ اور انسانوں کی اللہ اور اس کے دین کی طرف روہ نمائی کا فریضہ بھی انھیں وراثت میں ملا ہے۔

اس میں یہ فضیلت بھی بیان کی گئی ہے کہ عابد پر عالمِ دین کو ایسے ہی امتیاز وبرتری حاصل ہے، جیسے رات کے وقت کامل چاند کو دیگر سارے ستاروں پر حاصل ہوتی ہے؛ کیونکہ عبادت کا نُور اور اس کا کمال محض عابد تک محدود رہتا ہے، جس میں عابد کے علاوہ کوئی دوسرا شریک نہیں ہوسکتا اور اس نور کی حیثیت محض کسی ستارے جیسی ہے، جبکہ علم کا نفور اور اس کا کمال یہ ہے کہ وہ عالم کے علاوہ دیگر انسانوں کو بھی مستفید ہونے کا موقع فراہم کرتا ہے۔آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس بات کا بھی ذکر فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام نے اپنے جانشینوں کے لیے دنیا کی کوئی بھی چیز وراثت میں نہ رکھی۔یہی وجہ ہے کہ انھوں ے دنیا میں درہم ودینار کی بجائے علم جیسی انتہائی عظیم میراث باقی رکھیڈ لہٰذا جس شخص نے اس علمی ورثے کو لے لیا، تو حقیقتاً اس نے بھرپور انداز میں انبیاء کی میراث پائی اور یہی حقیقی اور نفع بخش میراث ہے۔ یہاں مسلمان کو اس غلط فہمی میں نہ رہنا چاہیے کہ فضیلت یافتہ عالم کی زندگی عمل سے اور عابد کی زندگی علم سے خالی ہوسکتی ہے؛ بلکہ اگر عابد کا دامن علم سے بھر جائے، تو وہ اپنے عمل میں قوی ہوجائے گا اور اگر عالم اپنے علم پر عمل پیرا ہوجائے، تو وہ اپنے علم میں قوی ہوگا۔اسی بنا پر انہی علماء کو انبیاء کا وارث قرار دیا گیا، جو علم اور عمل کی اعلیٰ خوبیوں کے حامل ہوں گے اور کمال (علم) اور تکمیل (اس کے مطابق عمل) کی فضیلتوں کو حرزِ جاں بنائے ہوئے ہوں گے۔اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھنے والوں اور اس کی راہ کے راہ گیروں کا یہی طریقہ ومنہج رہا ہے۔

ایک دوسری روایت میں ہے:

وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ، قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ خَرَجَ فِيْ طَلَبِ الْعِلْمِ فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، حَتّٰى يَرْجِعَ.

(رواه الترمذي:٢٦٤٧)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''جو شخص طلبِ علم میں (اپنے گھر سے) نکلتا ہے وہ ایسے ہے جیسے اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والا، یہاں تک کہ وہ واپس لوٹ آئے''۔

حدیث کا مفہوم:

جوشخص اپنے گھر یا اپنے شہر سے شرعی علم کے حصول کے لیے نکلتا ہے وہ اس شخص کی مانند ہے جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کے لیے نکلتا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے گھر والوں کے پاس واپس لوٹ آئے؛ کیونکہ ایسا شخص دین کے احیاء، شیطان کو نیچا دکھانے اور اپنے آپ کو مشقت میں مبتلا کرنے میں ایسے ہی ہے جیسے جہاد کرنے والا ہوتا ہے۔

اور جو آدمی اپنے عزیز واقارب کو چھوڑ کر ماں باپ کی محبت وشفقت سے منہ پھیر کر اور اپنے گھر بار کی تمام راحتیں ترک کر کے علمِ دین حاصل کرنے کے لیے اپنے وطن وشہر سے نکلتا ہے خواہ وہ علم فرضِ عین ہو یا فرضِ کفایہ یعنی ضرورت وحاجت سے زیادہ، تو وہ طالبِ علم مجاہد فی سبیل اللہ کے مرتبہ کا ہوتا ہے، جو ثواب اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کو ہوتا ہے وہی ثواب اس طالب کو بھی ملتا ہے؛ اِس لیے کہ جس طرح ایک مجاہد سر پر کفن باندھ کر محض اس جذبہ سے میدانِ جنگ میں پہنچتا ہے کہ وہ اللہ کے دین کو سربلند کرے اور اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کا بول بالا کرے، اِسی طرح طالبِ علم محض اس مقصد کے لیے علمِ دین حاصل کرنے کے لیے گھر سے نکلتا ہے؛ تاکہ وہ اپنے نفس کی تمام خواہشات کو ختم کر کے اور کسرِ نفسی اختیار کر کے علمِ الٰہی کی مقدس روشنی سے ظلم وجہل کی تمام تاریکیوں کو دُور کر دے، اللہ کے دین کو تمام عالم میں پھیلائے اور شیطان کے مکر وفریب سے لوگوں کو محفوظ رکھ کر شیطان کو ذلیل وخوار کرے؛ لہٰذا یہ جب تک علم حاصل کر کے اپنے گھر واپس نہیں آجاتا برابر میدانِ جہاد کا ثواب حاصل کرتا رہتا ہے۔

پھر اس حدیث میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جب طالبِ علم حصولِ علم سے فارغ ہو کر اپنے گھر واپس آجاتا ہے تو اس سے بھی زیادہ مرتبہ اور درجہ پاتا ہے؛ کیونکہ جب وہ تعلیم کو مکمل کر کے لوٹتا ہے تو دنیا میں علم ومعرفت کی روشنی پھیلانے، لوگوں کو تعلیم دینے اور انسانی زندگی کو علم وعمل سے کامل کرنے کے لیے ایک مصلح اور معلم کی حیثیت میں آتا ہے، جس کی وجہ سے وہ وارث انبیاءؑ کے معزز ومقدس لقب سے نوازا جاتا ہے۔

اگر علم کو دل پروری کا ذریعہ بناؤ کہ دل بن جائے، دل اللہ والا ہو جائے، اللہ کی رضا حاصل ہو جائے، تو یہ علم تمہارا بہترین دوست ہے؛ اِسی لیے حدیثِ پاک میں ہے، ترمذی شریف کی حدیث ہے: مَنْ خَرَجَ فِيْ طَلَبِ الْعِلْمِ كَانَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَرْجِعَ. (جو اللہ کی رضا کے لیے علم کی طلب میں گھر سے نکلا، اُس کے لیے اُس مجاہد کا ثواب ہے جو جہاد کے لیے نکلا ہے، یہاں تک کہ وہ گھر لوٹ آئے؛ کیونکہ دین کو زندہ کرنے میں اور شیطان کو ذلیل کرنے میں اور نفس پر مشقت اُٹھانے میں وہ مجاہد ہی کی طرح ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو علمِ دین سیکھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

❑❖❑

سیرتِ نبویؐ

اپنی جان اور اپنی اولاد سے بڑھ کر!

ازقلم: فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی، ترجمان وسکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات صرف مسلمانوں کے ایمان ہی کا مرکز نہیں ہیں؛ بلکہ مسلمانوں کی محبت اور تعظیم وتوقیر کا بھی مرجع ہیں، اگر کسی مسلمان کے ماں باپ کو گالی دے دی جائے تو اس کا دل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کا عشر عشیر بھی زخمی نہیں ہوتا، مسلمان دینی اعتبار سے کس قدر بھی گیا گزرا ہو، بے نمازی ہو، شراب نوشی اور سود خوری میں مبتلا ہو اور کوئی بڑا سے بڑا گناہ کرتا ہو، غیرت ایمانی اس کو ان بڑے بڑے گناہوں سے روک نہیں پائی، تب بھی حضور کی شان میں گستاخی اس کو تڑپا دیتی ہے، وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر اپنی عزیز ترین جان، اپنے محترم ماں باپ اور اپنی متاع زندگی اولاد کو قربان کرنے کو تیار ہو جاتا ہے، اس محبت وعظمت کی مذاہب کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رو در رو کہہ دیا تھا کہ تم جاؤ، تمہارے رب جائیں اور دشمن سے مقابلہ کریں، ہم تو اس میں شریک نہیں ہو سکتے: ﴿اذهب أنت وربك فقاتلا إنا ههنا قاعدون﴾ (المائدہ:۲۴) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بائبل کے بیان اور عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق سرِ عام پھانسی دے دی گئی؛ لیکن امت عیسوی کا کوئی فرد اُن کو بچانے کے لیے آگے نہیں بڑھا؛ مگر امت محمدیہ کی تاریخ اس سے بالکل مختلف ہے۔

اس محبت کا منظر دیکھنا ہو تو آیئے اصحاب رسول کی مجلس میں، یہ حضرت سعد ابن ربیعؓ ہیں، زخم سے چور ہیں، ایک دو نہیں بارہ بارہ تیر نے جسم کو چھلنی کر دیا ہے، اسی حالت میں میدان اُحد کے کسی کونے میں پڑے ہوئے ہیں، نظر پڑی حضرت ابی ابن کعبؓ پر، زندگی کی اس آخری سانس میں اپنے بیوی بچوں کے لیے کوئی پیغام نہیں دیا؛ بلکہ فرمایا: جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچنا تو میرا اسلام پہنچانا اور میری کیفیت بتا دینا، اور ہاں، میری قوم سے کہہ دینا کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جان چلی جائے اور قوم کا ایک فرد بھی زندہ بچا ہوا ہو تو اللہ کے سامنے کوئی معذرت قبول نہیں ہوگی: **وأخبر قومك أنه لا عذر لهم عند الله إن قتل رسول الله صلى الله عليه وسلم وواحد منهم حيّ (مؤطا مالك، كتاب الجهاد: ۲/ ٤٦٥-٤٦٦)**

لوگوں کی بھیڑ جمع ہے، اس میں چھوٹے بھی ہیں اور بڑے بھی، تیاری ہے حضرت زید بن دثنہؓ کے قتل کی،

غزوہ بدر کے بعض قریش مہلوکین کا بدلہ لینے کے لیے قتل کی تیاری میں ہیں، اتنے میں ایک پوچھنے والے نے پوچھا: اے زید! میں تم کو اللہ کا حوالہ دیتا ہوں، کیا تم کو اس وقت یہ بات پسند نہیں ہے کہ تم ابھی اپنے گھر والوں کے درمیان ہوتے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہاری جگہ میرے پاس ہوتے، اور ہم ان کا سر قلم کر دیتے، حضرت زیدؓ نے بلا تأمل اور برجستہ فرمایا: ہرگز نہیں، خدا کی قسم مجھے تو یہ بھی پسند نہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی کانٹا چبھ جائے، جس سے ان کو تکلیف ہو، اور میں اپنے اہل وعیال کے درمیان بیٹھا رہوں، ابوسفیان اس مجمع میں موجود تھے جو اہل مکہ کے قائد تھے اور اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے، وہ کہنے لگے: خدا کی قسم! محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقاء آپ سے جس قدر محبت کرتے ہیں، میں نے کسی قوم کو کسی سے اس درجہ محبت کرتے ہوئے نہیں دیکھا: **ما رأيت من الناس أحدا يحب كحب أصحاب محمد محمدا صلى الله عليه وسلم** (طبقات ابن سعد: ٥٦/٢)

قبیلۂ بنو دینار کی ایک خاتون غزوۂ احد میں بڑی مصیبت سے گزریں، یکے بعد دیگرے ان کے شوہر، ان کے بھائی اور ان کے والد کی شہادت کی اطلاع دی گئی، وہ اِنا للہ پڑھتیں، اس صدمہ پر جو فطری غم ہوتا ہے، اس کا اظہار کرتیں؛ لیکن دریافت کرتیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے؟ لوگ کہتے: اللہ کا شکر ہے کہ تمہاری چاہت اور خواہش کے مطابق وہ بخیر ہیں، کہنے لگیں: مجھے ایک نظر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھا دو، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ کر کے انہیں دکھایا گیا تو بے ساختہ بول اٹھیں: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہر مصیبت ہیچ ہے: **كل مصيبة بعدك جلل يا رسول الله** (سیرت ابن کثیر: ۹۳/۳) اسی غزوۂ احد میں ایک خاتون اپنے بیٹے، والد، شوہر اور بھائی کے ساتھ پہنچیں، ایک ایک کر کے یہ سب شہید کر دیے گئے، جب لاشوں کو دیکھنے آئیں اور پوچھنے لگیں کہ یہ کون ہیں تو انہیں بتایا گیا، یہ تمہارے والد ہیں، یہ تمہارے بھائی ہیں، یہ تمہارے شوہر ہیں اور یہ تمہارے بیٹے ہیں، کہنے لگیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے؟ لوگوں نے ان کو آگے پہنچایا اور کہا: یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، انھوں نے بے تابانہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑے کو تھام لیا اور کہنے لگیں: اللہ کے رسول! آپ پر میرے ماں باپ قربان، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم محفوظ ہیں تو پھر مجھے کوئی پرواہ نہیں (المعجم الاوسط: ۲۸۰/۷، حدیث نمبر: ۷۴۹۹) ہوسکتا ہے یہ دو الگ الگ واقعات ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہی واقعہ ہو جس کو دو راویوں نے الفاظ کے کسی قدر فرق کے ساتھ نقل کیا ہو۔

اللہ کی طرف سے صحابہ کرامؓ کے سینے کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بے پناہ محبت سے معمور کر دیا گیا تھا، وہ کہتے تھے کہ میرا سب کچھ آپ پر قربان، اور یہ صرف الفاظ نہیں تھے؛ بلکہ ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس جذبہ کا

عکاس تھا، یہ محبت صحابہ سے امت کو میراث میں ملی ہے، واقعی ایک مسلمان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے اپنے وجود سے بڑھ کر محبت کرتا ہے، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے ایک صاحب نے دریافت کیا کہ یہ جو بات فرمائی گئی ہے کہ کوئی بھی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا، جب تک اس کے دل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اپنی جان اپنے ماں باپ اور اپنی اولاد سے بڑھ کر نہ ہو، اس میں تأمل ہوتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ اولاد کی محبت بڑھی ہوئی ہو، حضرت تھانویؒ نے ان سے پوچھا بتاؤ: اگر تمہارا بیٹا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دے تو تم کیا کروگے، وہ برجستہ کہنے لگے: میں تو اسے قتل کردوں گا، حضرت تھانویؒ نے فرمایا: یہی ہے اولاد کی محبت سے بڑھی ہوئی محبت، ابھی جھارکھنڈ کے صدر مقام رانچی کی ایک خاتون کے اکلوتے بیٹے مدثر کو گستاخیٔ رسول کے خلاف ہونے والے احتجاج میں شہید کردیا گیا اور اس کی زبان سے آخری لفظ نکلا ''اسلام زندہ باد'' پھر جو بات پیش آئی اس نے صحابہؓ کے زمانہ کی یاد تازہ کردی، جب اس کی بوڑھی کم پڑھی لکھی ماں سے میڈیا کے نمائندہ نے ملاقات کی تو اس مؤمن خاتون نے کہا: ''**مجھے اپنے شہید بیٹے پر فخر ہے کہ اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر اپنی جان قربان کردی ہے اور اسلام زندہ باد کہتے ہوئے دنیا سے گیا ہے، اسلام کل بھی زندہ باد تھا، آج بھی زندہ باد ہے اور کل بھی زندہ باد رہے گا**'' اس خاتون کا بیان سن کر میری آنکھیں واقعی نم ہوگئیں، میرے دل نے کہا کہ جس امت میں ایسی صاحبِ ایمان اور بلند ہمت مائیں ہوں گی، وہ امت کبھی بزدل اور کم حوصلہ نہیں ہوسکتی، وہ سمندر میں تیر کر اور آگ کے شعلوں پر چل کر گزر جائے گی؛ لیکن اپنے ایمان کو ڈوبنے اور جلنے نہیں دے گی۔

اس وقت ضرورت ہے کہ پوری قوت اور استقامت کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا جائے، مسلمانوں کے حوصلہ کو بلند رکھا جائے، ان کو بزدل اور کم ہمت ہونے سے بچایا جائے، ان کے اندر عزم وحوصلہ پیدا کیا جائے، ان کے ذہن میں یہ بات راسخ کی جائے کہ مومن اپنا آخری قطرۂ لہو نچھاور کرسکتا ہے؛ لیکن ظلم وجور اور کفر وشرک کے آگے سرنگوں نہیں ہوسکتا، مسلمان وہ نہیں ہے جو پھولوں کی سیج پر چلتے ہوئے تو اللہ کا نام لے اور جب اسے کانٹوں پر گزارا جائے تو وہ اللہ کو بھول جائے، جو طرب ونشاط کے ماحول میں تو اپنے مسلمان ہونے پر فخر کرے؛ لیکن ظلم وجور کے سائے میں اپنے دین کا نام لینے سے گھبرا جائے اور مذاق اڑانے والوں کے درمیان دینی نسبت پر شرمسار ہونے لگے۔

اس ملک میں برطانوی اقتدار کے دَور میں بھی اور اس کے بعد بھی مسلمان بہت سی آزمائشوں سے گزرے ہیں، انسانی خون اتنی مقدار میں بہایا گیا ہے کہ اگر ان سب کو کسی دریا میں بہا دیا جاتا تو شاید پانی کا رنگ بدل جاتا؛ لیکن ان سب کے باوجود ہمارے بزرگوں نے صبر اور ثابت قدمی کا راستہ اختیار کیا، انھوں نے مال وزر سے

ہاتھ دھونا گوارہ کیا، عزت وعصمت کی پامالی کا زخم بھی سہا، خون میں لت پت اپنے عزیزوں اور قرابت داروں کی لاشوں کو اپنے ہاتھوں سے دفن کیا اور خود اپنی زندگی کی قربانی دی؛ لیکن جس دین کو انھوں نے سوچ سمجھ کر قبول کیا تھا، یا اُن کے آباواجداد نے قبول کیا تھا اور انہیں اپنے بزرگوں سے یہ میراث ملی تھی، انھوں نے اسے اپنے سینے سے لگائے رکھا، اسی راہ پر ہمیں چلنا ہے اور یہی ہماری منزل ہے کہ اسلام کی اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ہمیں اپنی جان اور اولاد سے بھی بڑھ کر عزیز ہے!!!

اصلاحِ معاشرہ

ماں کی ممتا

ازقلم: حضرت مولانا مفتی سیّد محمد عفان صاحب منصور پوری (صدر المدرسین جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد، امروہہ)

عن انس بن مالک: جاء ت امرأة إلى عائشة رضي الله عنها، فاعطتها عائشة رضي الله عنها ثلاث تمرات، فاعطت كل صبي لها تمرة، وأمسكت لنفسها تمرة، فأكل الصبيان التمرتين ونظرا إلى امهما، فعمدت إلى التمرة فشقتها، فاعطت كل صبي نصف تمرة فجاء النبي صلى الله عليه و سلم فاخبرته عائشة رضي الله عنها فقال: وما يعجبک من ذلک؟ لقد رحمهاالله برحمتها صبيَّها. (اخرجه الحاكم في المستدرك ١٧٧/٤)

ماں کا ایثار

حضرت انسؓ فرماتے ہیں: کہ ایک خاتون (جو دیکھنے میں کمزور حال کی محسوس ہورہی تھیں) اپنے دو بچوں کو گود میں لے کر حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئیں، حضرت عائشہ نے ان کو تین کھجوریں عنایت فرمائیں، ایک ایک کھجور ماں نے اپنے بچوں کو دے دیں پھر ماں اس تیسری کھجور کو خود کھانے کا ارادہ کرکے اپنے منھ کے قریب ہی لے جاتی ہے کہ بچے وہ کھجور بھی ماں سے مانگنے لگتے ہیں، ماں کی ممتا دیکھیے جو خود بھوکی تھی، جب کہ وہ سائلہ بن کر حضرت عائشہ کی خدمت میں حاضر ہوئی تھی۔ جب بچوں کی طرف سے مطالبہ اس کے سامنے آیا تو اس نے اس کھجور کے دو ٹکڑے کیے اور دونوں بچوں میں تقسیم کردیے اور خود بھوکی رہی۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میں نے یہ واقعہ نبی کریم علیہ السلام کو سنایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس میں تعجب کی کیا بات ہے اپنے بچوں کے ساتھ رحمت وشفقت کا معاملہ کرنے کی وجہ سے اس ماں نے اپنے آپ کو بھی رحمت الٰہیہ کا مستحق بنالیا۔

ان جملوں سے نبی کریم علیہ السلام نے امت کو یہی تلقین فرمائی ہے کہ بڑوں کی طرف سے چھوٹوں کے سلسلہ میں جب اس محبت کا اظہار کیا جائے گا تو جہاں چھوٹوں کی محبت ان کو حاصل ہوگی وہیں وہ اللہ کی نگاہ رحمت کے بھی مستحق بنیں گے۔

بچوں سے پیار

عن عروة عن عائشة رضي الله عنها قالت: جاء أعرابي إلى النبي صلى الله عليه وسلم فقال اتقبلون صبيانكم؟ فما نقبلهم، فقال النبى صلى الله عليه وسلم: أوأَملِكُ لک ان نزع الله من قلبک الرحمة؟ (صحيح البخاري: ٥٩٩٨)

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک دیہاتی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا کہ تم لوگ اپنے بچوں کو بوسہ دیتے ہو ہم تو کبھی اپنے بچوں کو بوسہ نہیں دیتے۔ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے تیرے دل سے شفقت اور مہربانی نکال دی ہے تو اس کا میرے پاس کیا علاج ہے؟

جب یہ صاحب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت بچوں کے ساتھ مشغول تھے، کسی کو گود میں لے رہے تھے کسی کا بوسہ لے رہے تھے، نو وارد دیہاتی نبی کریم علیہ السلام کے اس عمل کو بڑی تعجب کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے کہ اتنا بڑا انسان، اتنے اونچے مرتبہ کے اوپر فائز اللہ کا نبی اور بچوں کے ساتھ بچے بنے ہوئے ہیں، نبی کریم علیہ السلام نے جب ان کے اس تعجب و حیرانی کو دیکھا تو فرمایا کہ تم تو مجھ کو ایسا دیکھ رہے ہو جیسا تم کبھی اپنے بچوں کا بوسہ لیتے ہی نہ ہو، ان سے اس طرح محبت کا معاملہ کرتے ہی نہ ہو، کیا معاملہ ایسا ہی ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ یارسول اللہ! ہم تو اپنے بچوں کو بالکل اچھوت سمجھتے ہیں، گود میں بھی نہیں لیتے، بوسہ بھی نہیں دیتے، محبت وشفقت کا یہ معاملہ بھی نہیں کرتے، تو نبی کریم علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: **او املک لک ان نزع الله من قلبک الرحمه** فرمایا! اب ہم کیا کر سکتے ہیں، اگر اللہ نے تمہارے دل سے محبت کے جذبات ہی نکال دیے تو ہم کہاں سے تمہارے دل میں بچوں کے سلسلہ میں رحمت ورافت کے جذبات ڈال سکتے ہیں۔

عن أبي هريرةؓ قال: قبل الرسول الله صلى الله عليه وسلم حسين بن عليؓ وعنده الاقرع من حابس التميمي جالس، فقال الأقرع: إن لي عشرة من الولده ما قبلت منهم أحدا، فنظر إليه رسول الله صلى الله عليه وسلم، ثم قال: "من لا يرحم لا يرحم. (صحيح البخاري، الأدب، ح: ٥٩٩٧)

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام نے اپنے نواسے حضرت حسنؓ کا بوسہ لیا، حضرت اقرع بن حابسؓ وہاں بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے جب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بچے کے ساتھ

یہ معاملہ کرتے ہوئے دیکھا تو بڑی حیرانی کا اظہار کیا اور کہنے لگے کہ یا رسول اللہ میرے بھی دس بچے ہیں؛ لیکن میں نے تو کبھی ان میں سے کسی کا بوسہ نہیں لیا تو آپؐ نے فرمایا: **من لا یرحم لا یرحم**. جو دوسروں کے ساتھ رحم وکرم کا معاملہ نہیں کرتا اس کے ساتھ بھی رحم وکرم کا معاملہ نہیں کیا جاتا۔

تم اگر بچوں کے ساتھ شفقت کا معاملہ نہیں کروگے تو جو اللہ رحمٰن ورحیم ہے، رب کریم ہے اس سے بھی تم رحم وکرم کی امید مت رکھنا؛ اس لیے کہ ضابطہ ہے کہ جو جیسا کرتا ہے ویسا ہی اس کو بھرنا پڑتا ہے۔ تم رحم کروگے تو اللہ کی رحمت کے مستحق بنوگے، اور اگر تم رحم کا معاملہ نہیں کروگے تو اللہ کی رحمت کے مستحق بھی نہیں بن پاؤگے۔ اس محبت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بچوں کو سر پر بٹھالیا جائے کہ وہ جیسا کہیں ویسا ہی کرنا ہے، الٹا کہیں تو الٹا کرنا ہے، سیدھا کہیں تو سیدھا کرنا ہے۔ ان کی کسی پیش کش کو رد نہیں کرنا ہے۔ ان کی کسی بات کو ٹھکرانا نہیں ہے، محبت ہو؛ لیکن اعتدال کے اندر ہو، میانہ روی کے ساتھ ہو؛ اس لیے کہ جو چیز بھی اعتدال سے باہر نکلتی ہے اس کے اندر خرابی پیدا ہوجاتی ہے۔

شفقت و محبت کے ساتھ ساتھ ان کی دینی تربیت کی فکر کرنا والدین کی اہم ذمہ داری ہے۔ بزرگان دین کہا کرتے تھے **الصلاح من اللّٰہ والادب من الآباء** (الادب المفرد ص:۹۲) صلاح ونیکی یہ اللہ کی طرف سے انعام ہوتا ہے۔ ادب وسلیقہ دینا، زندگی کے اصول سکھانا، بہترین تربیت کرنا، یہ والدین کا کام ہوتا ہے۔ والدین اپنی ذمہ داری ادا کریں، ادب سکھانے کی ہر ممکن کوشش کریں، نیک بنانے کی ہر ممکن کوشش کریں اللہ کی طرف سے بچوں کو صلاح عطاء کی جائے گی اور اچھی زندگی کا حامل ان کو بنایا جائے۔ نبی کریم علیہ السلام نے فرمایا: ایک ماں اور ایک باپ اپنے بچے کو اسلامی آداب سے زیادہ بہتر کوئی دوسرا تحفہ نہیں دے سکتے۔

ہر حال میں شکرِ الٰہی بجالانا چاہیے

حدثنا بشر بن محمد قال: اخبرنا عبداللہ قال: اخبرنا صفوان بن عمرو قال: حدثنی عبدالرحمٰن بن جبیر بن نفیر عن أبیہ قال: جلسنا إلی المقداد ابن الاسودؓ یوما، فمربہ رَجُلٌ فقال: طُوبی لھاتین العَیْنَیْن اللتین رأتا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واللہ لَوَدِدنا انا راینا ما رأیت، وشھدنا ما شھدت، فاستغضب، فجعلتُ اعجب، ما قال إلا خیرا، ثم اقبل علیہ فقال: وما یحمل الرجل علی ان یتمنی محضرا غیبہ اللہ عنہ؟ لا یدري لو شھدہ کیف یکون فیہ؟ واللہ لقد حضر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اقوام کبھم اللہ علی مناخرھم في جھنم، لم یحبوہ ولم

يصدقوه اولا تحمدون الله عز وجل إذ اخرجكم لا تعرفون إلا ربكم، فتصدقون بما جاء به نبيكم صلى الله عليه وسلم، قد كفيتم البلاء بغير كم، والله! لقد بعث النبي صلى الله عليه وسلم على اشد حال بعث عليها نبي قط، في فترة وجاهلية، ما يرون ان دِينًا افضل من عبادة الاوثان، فجاء بفرقان فرق به بين الحق والباطل، و فرق به بين الوالد و ولدهِ حتى إن كان الرجل ليرى والده او ولده او اخاه كافراً، وقد فتح الله قفل قلبه بالإيمان، و يعلم انه إن هلك دخل النار، فلا تقر عينه وهو يعلم ان حبيبه في النار، و انها للتي قال الله عز و جل ﴿وَالَّذِيْنَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ﴾ (الفرقان: ٧٤) (اخرجه احمد ٢/٦ ٣٤٣١١)

ایک مرتبہ حضرت مقداد ابن اسودؓ مجمع میں تشریف فرما تھے، ایک صاحب کا گزر اس مجمع کے قریب سے ہوا، ان کو پتہ چلا کہ یہاں حضرت مقداد ابن اسودؓ تشریف فرما ہیں، جو اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں، تو ان کو بڑا رشک ہوا، وہ کہنے لگے کاش کہ ہمیں بھی وہ آنکھیں ملتیں جن سے ہم نے نبی کریم کا دیدار کیا ہوتا، آپ کی زیارت کی ہوتی، افسوس کہ ہم اس زمانے میں دنیا میں آئے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے پردہ فرما چکے تھے۔

حضرت مقدادؓ نے ان کی اس حسرت کو جب سنا تو ناراض ہوئے، لوگوں نے کہا حضرت اس میں ناراضگی کی کونسی بات ہے، یہ ایک آدمی کا جذبہ ہے، آپ کو دیکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد ان کو آئی، اور اپنے اوپر حسرت کرنے لگے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا موقع نہ مل سکا، آپ خوش نصیب ہیں کہ آپ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار کا شرف حاصل ہوگیا، یہ تو بڑا جذبہ ہے اس پر آپ ناراض کیوں ہو رہے ہیں، ارشاد فرمایا! اللہ جس انسان کے لیے جو مقدر فرماتے ہیں وہی اس کے لیے بہتر ہوتا ہے، اس طرح کی حسرت ان کو نہ کرنی چاہیے؛ اس لیے کہ ہوسکتا ہے کہ اس زمانے میں یہ ہوتے؛ لیکن ان کو جناب رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہنے کا اور آپ کے دست حق پرست پر ایمان لانے کا موقع نہ ملتا۔

حضرت مقدادؓ اس آدمی کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ آدمی کو کون سی چیز اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ ایک ایسے زمانہ کی تمنا کرے جس سے اللہ نے اس کو دور رکھا ہے جبکہ اس کو معلوم نہیں کہ اگر وہ اس زمانہ کو پاتا تو اس کا کیا حال ہوتا؟ اللہ تعالیٰ کی قسم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ بہت سے لوگوں نے پایا جن کو اللہ تعالیٰ نے اوندھے منھ جہنم میں ڈالا، انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول نہیں کیا اور آپ پر ایمان نہیں لائے۔ کیا تم لوگ اس پر اللہ کی حمد وثنا نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو ایسے زمانہ میں پیدا کیا کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کو تم پہنچاتے

ہی نہیں ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم جن چیزوں کو لے کر آئے اسی کی تم تصدیق کر رہے ہو اور آزمائش کا زمانہ دوسروں نے اُٹھایا۔اللہ کی قسم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے زمانہ میں مبعوث ہوئے کہ کوئی بھی نبی ایسی سخت حالت میں نہیں بھیجا گیا یعنی جاہلیت اور فترت کا زمانہ تھا،اور وہ لوگ بت پرستی میں ایسے مبتلا تھے کہ وہ اسی کو سب سے بہتر دین سمجھ رہے تھے پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کھلم کھلا ایسی دلیل لے کر آئے جس نے حق اور باطل کے درمیان تمیز کر دی اور باپ اور بیٹے کے درمیان بھی فرق کر دیا اور بسا اوقات آدمی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ اس کا باپ،اس کا بیٹا یا اس کا بھائی کافر ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے دل کو ایمان کے لیے کھول دیا اور وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ میرا باپ،میرا بھائی اور میرا بیٹا اگر اسی حالت میں مرا تو جہنم میں جائے گا اور اس کی آنکھیں اس سے ٹھنڈی نہیں ہوں گی اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ وہ تو جہنم میں جائے گاو انها للتي قال الله عز و جل " وَالَّذِيْنَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ" (الفرقان: ٧٤)

اور یہی مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا ﴿وَالَّذِيْنَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ﴾ (الفرقان: ٧٤) کہ ایمان والے وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں ہماری بیوی اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما۔

حضرت مقدادؓ کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ پاک نے جس حال میں بھی تم کو رکھا ہے اس کا شکر گزار ہونا چاہیے؛اس لیے کہ نہ معلوم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہوتے تو ایمان لانے کا موقع بھی ملتا یا نہ ملتا تو نہ جانے پھر کس حشر کا اور کس طرح کے حالات کا سامنا کرنا پڑتا،اللہ تعالی نے ہمیں بھی اس زمانے میں پیدا کیا کہ جس میں نہ ہم نے صحابہ کو دیکھا نہ تابعین کو نہ تبع تابعین کو،حسرت ہوتی ہوگی؛لیکن شکر اللہ کا اس بات پر بجا لانا چاہیے کہ ان تمام بڑوں کو نہ دیکھنے کے باوجود بھی اللہ نے ان کے مشن اور تحریک کے مطابق ہمیں زندگی گزارنے کا موقع عنایت فرمایا۔

اولاد آنکھوں کی ٹھنڈک

حضرت مقداد بن اسودؓ مہاجرین میں سے ہیں اور جلیل القدر صحابی ہیں،غزوۂ بدر کے موقع پر مسلمانوں کا ایک ہی گھوڑا تھا،یہی گھوڑے پر سوار تھے،جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ مکہ مکرمہ سے مشرکین کا لشکر اپنے تجارتی قافلے کی حفاظت کی غرض سے نکل چکا ہے تو،حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو مشورہ کے واسطے جمع کیا کہ اب کیا کیا جائے؟اس لیے کہ اب حالات بدل گئے ہیں اور لشکر سے مقابلہ کی

صورت پیدا ہوگئی ہے، آپ یہ چاہتے تھے کہ اس سلسلے میں صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی رائے معلوم کریں، تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ وہ منظر میری نگاہوں کے سامنے ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا کہ اب کیا کیا جائے؟ تو حضرت مقداد بن اسودؓ نے جواب میں عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ! ہم بنی اسرائیل کی طرح نہیں کہیں گے جیسا انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کہا تھا کہ (**فاذھب انت و ربک فقاتلا انا ھھنا قاعدون**) آپ اور آپ کے رب جائیے اور لڑیئے اس لیے کہ ہم تو یہاں بیٹھے ہیں، بلکہ ہم تو آپ کی دائیں طرف سے، آپ کی بائیں طرف سے، آپ کے آگے سے اور آپ کے پیچھے دشمنوں کا مقابلہ کریں گے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ آپ کی یہ بات سن کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا اور خود ابن مسعودؓ تمنا کرنے لگے کہ کاش یہ جملہ میری زبان سے نکلا ہوتا تا کہ یہ سعادت مجھے حاصل ہوتی۔

حدیث شریف سے یہ بھی پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جس حال میں اور جس زمانہ میں رکھا ہے وہی ہمارے لیے بہتر ہے، بیشک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ سب سے بہتر زمانہ تھا، مگر اس زمانہ میں ایمان لانا اور ایمان لانے کے بعد ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنا یہ سب کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس لیے حضرت مقدادؓ نے اس شخص کو فرمایا کہ بھائی یہ ضروری نہیں کہ تم وہ زمانہ پاتے تو تم بھی اسی حالت میں (مسلمان) ہوتے؛ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو ایسے ماحول میں پیدا کیا کہ چاروں طرف ایمان والا ماحول ہے، تم سب کو ایمان والا ہی پا رہے ہو، تمہارا باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی اور تمہارا پورا خاندان سب ہی مسلمان ہیں، اس سے تمہاری آنکھیں ٹھنڈی ہو رہی ہیں، اس سے خوش ہونا چاہیے، اس کی کیوں تمنا کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے جس زمانہ میں تم کو پیدا نہیں کیا اس زمانہ میں پیدا ہوتے جبکہ تم کو پتہ نہیں کہ کیا ہوتا؟ (فتح الله الاحد ۱۸٤/۱)

❑❖❑

اصلاحِ معاشرہ

نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ و بالا

ازقلم: مولانا ڈاکٹر محمد اسجد قاسمی ندوی صاحب شیخ الحدیث و مہتمم مدرسہ عربیہ امدادیہ مرادآباد

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصد بعثت کے ذیل میں قرآن کریم نے جابجا تعلیمِ الفاظ و معانیٔ قرآن، تعلیم حکمت وسنت، اور تزکیہ واصلاحِ باطن کا ذکر کیا ہے، سورۃ الجمعۃ میں مذکور ہے ''وہی وہ ذات ہے جس نے ناخواندہ لوگوں کے اندر انھیں میں سے ایک پیغمبر مبعوث فرمایا جو انھیں اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے، ان کی زندگیاں سنوارتا ہے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ اس سے پہلے وہ لوگ صریح گمراہی میں مبتلا تھے''۔(الجمعۃ:۲)

سلسلۂ نبوت کے انقطاع کے بعد ان مقاصد نبوت کی روشنی میں کام کرنے کی وراثت وامانت کا حق ادا کرنے کی ذمہ داری علماء امت پر ڈالی گئی ہے، خود ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ''علماء انبیاء کے وارث ہیں، انبیاء کی وراثت دنیا رو درم نہیں بلکہ علم ہے'' ہر دور میں علمائے حق نے انبیاء کی تعلیمات وعلوم کی وراثت کا حق ادا کیا، مقاصدِ بعثتِ رسول کی روشنی میں اپنا علمی، تعلیمی، دعوتی وتربیتی سفر تیز روی سے جاری رکھا> چونکہ انبیاء اپنی امتوں کے امام وقائد ہوتے ہیں، وارث ہونے کے ناطے سے علماء کا بھی اصل منصب امامت وقیادت ہے جو بڑا عظیم ترین اور نازک ترین منصب ہے، قیادت نوالۂ تر نہیں جو آسانی سے میسر آسکے، بلکہ اس راہ میں شب وروز انتھک محنت کرنی پڑتی ہے، لگاتار کوشش اور پیہم جد وجہد کرنی پڑتی ہے، قربانیاں دینی پڑتی ہیں، جذبات وخواہشات کو لات مارنا پڑتا ہے، غلط پروپیگنڈوں، الزامات، تہمت وبہتان طرازیوں اور طنزیہ پھبتیوں کو سہنا پڑتا ہے۔

برصغیر کے مسلمان اس لحاظ سے بڑے خوش قسمت ہیں کہ وہاں مدارس اسلامیہ کا ایک جال بچھا ہوا ہے اور اب کوئی خطہ ایسا باقی نہیں بچا جہاں یہ علماء دین مدارس ومکاتب اور مساجد میں بے سروسامانی اور ناتوانی کے باوجود ہر طرح کی مشقتوں کے عالم میں خدمتِ دین کا اپنا فرضِ منصبی انجام نہ دے رہے ہوں، برصغیر کی ملت اسلامیہ جب جب کسی آزمائش سے دوچار ہوئی ہے، سخت حالات سے گزری ہے، کشمکشوں کا سامنا کیا ہے، اسلام دشمن طاقتوں کی دشمنانہ سرگرمیوں کا ہدف بنی ہے تب تب اِن مدارس کے تربیت یافتہ علماء کی ٹیم میدانِ عمل

میں اتری ہے، اور ہر مرحلہ پر صبر واستقلال، استقامت و پامردی اور عزیمت وشکیمت کا جو ثبوت اِس گروہِ علماء نے پیش کیا ہے نہ تو اُسے جھٹلایا جاسکتا ہے اور نہ اس سے آنکھیں بند کی جاسکتی ہیں، واقعہ یہی ہے کہ کتاب وسنت کے جو علوم اِن مدارس ومساجد کی چہار دیواروں میں سکھائے جاتے ہیں اور تربیت وتزکیہ کی جو شمعیں فروزاں کی جاتی ہیں وہی سرمایۂ زندگی اور حاصلِ حیات ہیں۔

دوسری طرف اُن افراد کا ایک گروہ ہے جو بڑے شد ومد سے مدارس اسلامیہ، ان کی افادیت، طریقۂ کار، منہج تعلیم، مشتملاتِ نصاب، نظامِ عمل، علماء وطلبہ، رہن سہن، قیام وطعام غرضیکہ تمام امور پر انگشت نمائی اور پروپیگنڈہ بازی میں بری طرح مصروفِ عمل ہے، اس کی نظر میں علماء دقیانوسی ہیں، رجعت پسند ہیں، تاریک خیال وتنگ نظر ہیں، ملک وملت کی کسی باعثِ فخر خدمت کے اہل نہیں ہیں، بدسلیقہ، غیر مہذب اور ناشائستہ ہیں، بنیاد پرست اور متعصب ہیں، مالدار علماء پر دنیا داری اور حرص کا الزام ہے، تہی دست علماء پر تاریک مستقبل کی طرف قدم بڑھانے کا اتہام ہے، گوشہ نشین اور یکسوئی سے تعلیم میں منہمک علماء پر دقیانوسیت اور رفتارِ زمانہ سے بے خبری کی تہمت ہے، سوسائٹی میں نکل کر اصلاحی کام کرنے والے، سیاست میں دخیل علماء پر اپنی حدوں سے نکل آنے کا بہتان ہے، غرض طعنوں کی ایک بارش ہے جو برسائی جارہی ہے، عام طور سے علماء مدارس ان طعنوں کو ہر دور میں دعوت دین کی راہ کا تحفہ اور اپنے اسلاف کی سنت باور کر کے جھیلتے، برداشت کرتے رہے ہیں، تاریخی تسلسل اس حقیقت سے پردہ اٹھاتا ہے کہ ہر دور میں علماء حق کو یہ طعنے سننے پڑے ہیں، اِس کوچہ اور گلی میں جس نے بھی قدم رکھا ہے جان ودل کے زیاں کو برداشت کرنے کا حوصلہ اکٹھا کر کے رکھا ہے اور طعنوں کو سر کا تاج اور گلے کا زیور سمجھا ہے، یہ طعنے حضرات انبیاء نے بھی سنے ہیں مگر تحمل واستقلال اُن کا شعار وامتیاز رہا، حضرت نوحؑ سے ان کی قوم نے کہہ دیا ''ہم تم کو صریح گمراہی میں مبتلا پاتے ہیں'' حضرت ہودؑ سے ان کی قوم نے کہا ''ہم تم کو بے عقلی میں مبتلا اور جھوٹا سمجھتے ہیں'' حضرت صالحؑ کو ان کی قوم نے مخبوط الحواس اور سحر زدہ قرار دیا، خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی قوم نے کیا کچھ نہیں کہا، ہر طرح کے طعنے اور اذیتیں دیں، اور پھر یہی صورت حال وارثانِ انبیاء، صحابہ کرام، تابعین، تبعِ تابعین اور ہر دور کے مجددین ومصلحین وداعیان وعلماء کے ساتھ رہی اور آج بھی ہے، اور قیامت تک علماء حق کو یہ طعنے سننے پڑیں گے، ہاں اِن طعنوں کا جواب قیامت کے روز اہل حق کی طرف سے دیا جائے گا، قرآن کہتا ہے کہ ''وہاں اہل ایمان کافروں پر ہنسیں گے'' وہاں طعنے دینے والے پست کر دیے جائیں گے اور وہاں عزت قرآن کے بقول ''اللہ ورسول اور مؤمنین مخلصین کو ملے گی''۔

علماء ہی کے گروہ نے ہر دور میں دین کے لیے سپر اور ڈھال کا کام کیا ہے، اور جب تک یہ گروہ اپنی اصلی

شکل وصورت میں موجود رہے گا۔ اوران شاء اللہ قیامت تک موجود رہے گا۔ تب تک کرۂ ارض سے اسلام کا نام مٹایا اور کھرچا نہیں جاسکے گا۔ جہاں یہ علماء نہیں ہیں وہاں اسلام کا حلیہ ہی بدل گیا اور ماڈل ہی چینج ہوگیا اور مادیت نے روحانیت پر قبضہ کرکے تمام قدروں پر تیشے چلاڈالے، برصغیر سے باہر متعدد اسلامی ملکوں میں عالمی طور پر مستند تعلیمی ادارے ہیں جہاں دینی تعلیم ہوتی ہے، کتاب وسنت کا درس ہوتا ہے، وہاں اعلیٰ درجہ کے محقق اور اسکالر افراد موجود ہیں اور تیار ہوتے ہیں، ان کی علمی تحقیقات واکتشافات دیکھ کر انسان انگشت بدنداں رہ جاتا ہے اوران کی علمیت کا لوہا مان لیتا ہے، مگر دوسری طرف ان کا اپنا طرزِ زندگی، لباس وہیئت، اور کردار وعمل دیکھا جائے تو اس دینی تعلیم کا کوئی عکس واثر اور ہلکی سی پَرچھائیں بھی ان کی ذاتی اور عملی زندگی میں محسوس نہیں ہوتی، فی الواقع یہ اس کا نتیجہ ہے کہ وہاں وہ مدارس اور علماء نہیں رہے یا انھیں رہنے نہیں دیا گیا جو علم سے زیادہ عمل کو قابل توجہ گردانتے ہیں، اور جو تعلیم کے ساتھ تربیت وتزکیہ کو پیش نظر رکھتے ہیں، یہ نہ جانے دین کا کون سا ایڈیشن ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا اسلام کو محض ایک نظریہ اور تاریخی فلسفہ کی حیثیت سے غیر مسلموں کی طرح پڑھتے ہیں، ایسے عالم میں ان بوریہ نشین علماء مدارس کی قدر معلوم ہوتی ہے جنھوں نے مدارس اسلامیہ کو اتباع سنت کی راہ پر گامزن کیا، اور حروف ونقوش کے کتابی ونظریاتی علم ہی پر اکتفانہ کی؛ بلکہ اس علم کو عملی پیکر بھی دیا، اور ایسے افراد تیار کرکے دِکھادیئے، ایک مشہور مفکر کی زبان میں ''جب ہندوستان میں حکومتِ مغلیہ کا چراغ گل ہوگیا اور مسلمانوں کا سیاسی قلعہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا تو بالغ نظر اور صاحبِ فراست علماء نے جابجا اسلام کی شریعت وتہذیب کے قلعے قائم کردیے، انھیں قلعوں کا نام عربی مدارس ہے، اور آج اسلامی شریعت وتہذیب انھیں قلعوں میں پناہ گزیں ہے، اور اس کی ساری قوت واستحکام انہیں قلعوں پر موقوف ہے'' (اسلام کے قلعے ص ۱۷/ از حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ) بقولِ مولانا آزاد مرحوم ''علم وسیلہ نہیں مقصد ہے، دنیا نے علم کو ہمیشہ وسیلہ سمجھا ہے مگر علماء برحق کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے علم کو کبھی وسیلہ نہیں سمجھا بلکہ ہمیشہ اُسے مقصد سمجھا'' (خطباتِ آزاد) فی الواقع علماء قوم کے لیے وہی درجہ رکھتے ہیں جو بھیڑوں اور بکریوں کے لیے گلہ بان اور چرواہے کا ہوتا ہے، ہمارے برصغیر میں یہ گلہ بان ریوڑ سے کبھی الگ نہیں ہوئے اور ہمیشہ علماء نے قوم میں اصلاح کا کام کیا، اس کا نتیجہ ہے کہ یہاں علوم اسلامیہ کی صحیح اور فطری چمک دمک بھی ہے، تاثیر بھی ہے اور رسوخِ علمی کے ساتھ عملی پاکیزگی بھی ہے؛ مگر جن اسلامی ملکوں میں یہ علماء اور مدارس نہ رہے اور ریوڑ کو گلہ بان سے الگ کردیا گیا وہاں بھیڑیوں نے ریوڑ کو جس طرح چاہا کھایا، نتیجہ یہ ہوا کہ قوم بدعملی وبے عملی کی آخری حدوں تک پہونچی، وہ دشمنوں کی سازشوں کا نشانہ بنتی گئی اور اُسے علمی، عملی، فکری، اخلاقی اور دینی ومذہبی ہر لحاظ سے بری طرح لوٹا کھسوٹا گیا۔

برصغیر کے دینی مدارس کی سب سے بیش بہا اور گراں مایہ دولت اور پونجی ان کا وہ خاص دینی مزاج و مذاق ہے جو انھیں اپنے اسلاف و اکابر سے ورثہ میں حاصل ہوا ہے، ''دنیا میں مختلف علوم وفنون پر دادِ تحقیق دینے والوں کی کبھی کمی نہیں رہی اور نرے ''علم'' کی حد تک تحقیق و تدقیق کے شناور دوسری معاصر درسگاہوں میں بھی بہت ہوئے؛ لیکن دارالعلوم دیوبند (اور اس سے ملحق برصغیر کے مدارس دینیہ) کی نیو ہی علم و عمل کے سنگم پر اٹھائی گئی تھی اور اس میں جس قدر توجہ طلبہ کی علمی صلاحیت بڑھانے کی طرف دی جاتی تھی، اس سے زیادہ ان کی علمی تربیت اور ان پر ادا ادا میں اسلاف کا رنگ چڑھانے کا اہتمام کیا جاتا تھا، وہاں دلوں میں خوف وخشیت کی آبیاری ہوتی تھی، وہاں عبادت کا ذوق پروان چڑھایا جاتا تھا، وہاں حلال وحرام بلکہ مکروہ ومستحب اور اولیٰ اور خلافِ اولیٰ کا صرف علم نہیں؛ بلکہ ان کی عملی فکر اور ان کی اہمیت دلوں میں جاگزیں کی جاتی تھی.....وہاں ایک ایک فرد کے دل میں یہ بات بٹھادی جاتی تھی کہ علم برائے علم اس کا مطمحِ نظر نہیں، اور نہ تحصیلِ علم کا مقصد مال وجاہ کا حصول ہے، بلکہ اصل مقصد اپنے آپ کو اعلیٰ اسلامی اوصاف سے آراستہ کرنا اور اس کے بعد انھیں اوصاف کو دوسروں تک منتقل کرنا ہے۔ (ہمارا تعلیمی نظام ص/۱۹۳ از مولانا محمد تقی عثمانی)

اس لحاظ سے یہ دینی تعلیمی ادارے صرف دانش گاہ ہی نہیں بلکہ تربیت گاہ بھی ہیں، یہی ان کا امتیاز ہے کہ یہاں علوم کی تعلیم کے ساتھ ہی نفوس کی تربیت بھی ہوتی ہے، یہ بہ یک وقت مدرسہ وخانقاہ دونوں میں، مدرسہ میں علم سیکھا سکھایا جاتا ہے، اور خانقاہ میں اخلاق کی طاقت (Moral Sprit) پیدا کی جاتی ہے، علم واخلاق ہی وہ دو گوہر آبدار ہیں جنھیں لے کر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اِس دنیا میں جلوہ گر ہوئے تھے، علماء انھیں دونوں چیزوں میں اپنے نبی کے وارث ہیں، اور یہ وراثت اِن مدارس دینیہ کے واسطہ سے نسل در نسل منتقل ہوتی جارہی ہے۔

نظام ونصابِ مدارس میں تبدیلیوں اور اصلاحات کے نام پر معاصر نام نہاد مفکرین کی طرف سے جو شور وہنگامے ہورہے ہیں وہ درحقیقت مقاصدِ مدارس کی روح مارڈالنے کے مرادف ہیں، ہاں مگر یہ حقیقت ہے کہ مدارس اور اہل مدارس کے امتیازی اوصاف اب بڑے کم یاب ہیں، اس باطنی انحطاط کا ذکر اقبال نے بھی کیا ہے ؎

اٹھا میں مدرسہ وخانقاہ سے نم ناک
نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

تمام مطلوبہ اوصاف، تشکیل ذہنی اور تعمیر سیرت، اخلاص واختصاص، تربیت وتزکیہ، عملی واخلاقی پاکیزگی، تغیر پذیر زمانے کی نزاکتوں اور تقاضوں کی پورے توازن کے ساتھ اس طرح رعایت کہ اس سے مدارس کی اصلی روح اور مشن کو ذرا بھی ٹھیس نہ پہونچے، یہ تمام وہ امور ہیں جن پر توجہ دینے کی سخت ضرورت ہے، اپنی خامیوں کے تمام تر

اعتراف اوراصلاح کی جد وجہد کے باوجود اقبال کی زبان میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ''اِن مکتبوں کو اسی حالت میں رہنے دو، غریب مسلمانوں کے بچوں کو انھیں مدارس میں پڑھنے دو، اگر یہ ملا اور درویش نہ رہے ..... اور اگر ہندوستانی مسلمان ان مدرسوں کے اثر سے محروم رہ گئے تو بالکل اسی طرح ہوگا جس طرح اندلس میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت کے باوجود آج غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈرات اور الحمراء کے نشانات کے سوا اسلام کے پیروؤں اور اسلامی تہذیب کے آثار کا کوئی نقش نہیں ملتا، ہندوستان میں بھی آگرہ کے تاج محل اور دلی کے لال قلعے کے سوا مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت اور ان کی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا'' واقعہ یہی ہے کہ ؎

اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موجِ تند جولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ وبالا

اصلاحِ معاشرہ

سالگرہ کا فتنہ عروج پر، معاشرہ کی اصلاح وقت کی اہم ترین ضرورت

ازقلم: مولانا عبدالقدوس صاحب مظاہری، استاذ مدرسہ انعام الحسن بنگلور

آج پوری دنیا میں مسلمانوں پر آفات اور مصیبتیں اُمنڈ اُمنڈ کر آرہی ہیں، اگر اس کی وجہ یہ بتلائی جائے تو غلط نہ ہوگا کہ یہ مصیبت، بُرائیوں، بے پردگی، اجنبی مَردوں کا اجنبی عورتوں سے اختلاط، اور دین میں نت نئے خرافات کے دخول کا نتیجہ ہے، یہ یہودیوں کے ناپاک منصوبے ہیں کہ مسلمانوں کے اندر سے انسانی معاشروں اور قوموں میں اخلاق کی دھجیاں اُڑادی جائیں اور ہر جگہ اخلاق وکردار کی جڑیں کھوکھلی کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، اور مسلمانوں کو اپنے دینی مقاصد سے ہٹا کر دنیاوی غیر تہذیبی مکروفریب میں مبتلا کرنے کی زبردست مہم چلائی جارہی ہے، جب یہود اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائیں گے تو پھر مسلمانوں کو دینِ اسلام سے خارج کرنا ان کے لیے بہت آسان ہوجائے گا، یہی وجہ ہے کہ آج اسلام پر عمل کرنے والے صرف ۵/فیصد لوگ باقی رہ گئے ہیں، باقی ۹۵/فیصد مسلمان گمراہیت کی طرف گامزن ہے، اور اس معاشرے کی اصلاح وقت کی اہم ترین ضرورت ہے، اور ایسی ایسی ہلاکت خیز اشیاء مسلمانوں کے سامنے بطور نمونہ پیش کی جارہی ہیں کہ لوگ اس کو دیکھ کر اسلام کا جزء سمجھ رہے ہیں، اور دیکھنے والا شخص غیر شعوری طور پر لازماً متاثر ہورہا ہے، رفتہ رفتہ اخلاق وکردار میں تبدیلی آرہی ہے، ان میں سب سے بڑی چیز جس کو آج لوگ دین کا داخلی حصہ سمجھ بیٹھے ہیں وہ سالگرہ منانا ہے، جس کو انگریزی زبان میں Barth Day کہا جاتا ہے اور جو لوگ اپنے آپ کو دین دار سمجھتے ہیں وہ بھی اس منحوس غیر شرعی عمل میں ملوث ہیں۔

سالگرہ (Barth Day) کی حقیقت:

بڑے بڑے گھرانوں اور عموماً متوسط گھرانوں میں بھی بچوں کی سالگرہ منائی جاتی ہے، رشتے داروں اور دوست واحباب کو مدعو کیا جاتا ہے، جو اپنے ساتھ بچے اور بڑوں کے لیے تحفے تحائف لے کر آتے ہیں خواتین وحضرات بلاتمیز محرم وغیر محرم کے ساتھ ایک ہی ہال میں جمع ہوجاتے ہیں، اور ایک بڑی میز کے گرد کھڑے ہوجاتے ہیں، اور ایک بڑا سا کیک کاٹ کر ایک دوسرے کا منھ میٹھا کرتے ہیں، اور پھر تالیوں کی گونج میں سالگرہ مبارک ہو یا پھر Happy Barth Day To You کی آوازیں آتی ہیں، اور یہ ہر سال پیدائشی تاریخ

کے اعتبار سے منایا جاتا ہے، یہ سلسلہ صرف بچپن کی حد تک محدود نہیں؛ بلک بوڑھے ہوکر قبر کے حوالے ہونے تک چلتا ہے، اور جو لوگ اپنے آپ کو کچھ زیادہ ہی دیندار سمجھتے ہیں وہ خود اپنی سال گرہ تو نہیں مناتے؛ لیکن دوسروں کی سال گرہ میں شرکت ضرور کرتے ہیں، اور بعض جگہ تو عیاشی میں ناچ گانے بھی ہوتے یں، جو سراسر گناہ خدا اور رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ناراض کرنے والا عمل ہے، اس سے نہ دنیا کا فائدہ ہے، اور نہ دین سے کوئی وابستگی ہے، یہ فحاشی اور عریانیت کا ٹھاٹھے مارتا ہوا سمندر ہے، اگر یہ عمل شریعتِ محمدیؐ میں جائز ہوتا تو سب سے پہلے آقائے نامدار جناب محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سالگرہ منائی ہوتی، پھر صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے منائی ہوتی، تاریخ کے اوراق کے گردانے کے بعد دُور دُور تک بھی اس کا ثبوت نہیں ملتا، اور سالگرہ منانے کی رسم انگریزوں کی ایجاد کردہ ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ'' (سنن ابی داؤد: ۵۵۹/۲) جو آدمی جس قوم کی مشابہت اختیار کرے گا وہ انہی میں سے ہوگا، اب غور کرنے کا مقام ہے کہ یہ طریقہ کس کا ایجاد کردہ ہے، اگر ہم اس طریقے کو اپنائیں گے تو ہم بھی ان ہی میں سے ایک فرد قرار پائیں گے، اب ہم خود اپنی عقلِ سلیم سے فیصلہ کریں کہ ہماری زندگی کے اندر غیروں کے کتنے طور طریقے اور خرافات موجود ہیں، سالگرہ (Barth Day) منانے کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے، یہ کوئی خوشی کا موقعہ بھی نہیں ہے؛ اِس لیے کہ انسان کی جیسے جیسے عمر بڑھتی ہے ویسے ویسے وہ موت کے قریب ہوتا جاتا ہے، اور اس کی زندگی میں سے ایک ایک دن کم ہوتا جاتا ہے؛ لہٰذا اس موقع پر خوشی منانے کا کیا مطلب ہے؟

اللہ تعالیٰ نے نسلِ انسانی کے تحفظ اور انسانی معاشرے کے قیام وبقا کے لیے انسانوں کے اندر دو جذبے ایسے رکھے ہیں کہ اگر وہ جذبات انسان کے اندر سے ختم ہوجائیں تو انسانیت کبھی کی مٹ چکی ہوتی، اور وہ ہیں حیاں اور غیرت، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر یہ جذبات انسان کے اندر سے مضمحل ہوجائیں تو انسانیت کی بقاء مشکل ہوجائے گی، صرف نام کے انسان باقی رہ جائیں گے اور کام تو درندوں کی طرح ہوتا رہے گا، جیسا کہ مغربی ممالک میں اس کا انجام سامنے آچکا ہے، اور اگر کسی معاشرے میں خدانخواستہ یہ جذبات فنا ہوجائیں تو بدکاری، عریانی اور فحاشی کے وہ مناظر سامنے آئیں گے کہ کہ الامان والحفیظ، جس کا بہت سارا اندازہ آج کی مغربی دنیا کو دیکھ کر کیا جاسکتا ہے، لاکھوں، کروڑوں کی تعداد میں پیدا ہونے والے حرامی بچے انسان کی فطری اُٹھان سے یکسر محروم ہوگئے ہیں، محبت، ایثار، قربانی اور اعتماد جیسے ناگزیر لطیف احساسات کا ان میں کوئی وجود نہیں، جیسا کہ ان کے جذبات کے بغیر سکون واطمینان کی اَنمول دولت انسانی معاشرہ کبھی بھی نہیں پاسکتا، اور اس حیاسوز اور اخلاق باختگی والی سال گرہ (Bartu Day) جیسی ہلاکت خیز تفریحات کا پہلا حملہ انسان کی انسانیت پر ہوتا ہے۔

حرفِ آخر:

میں ہاتھ جوڑ کر دست بستہ گزارش کرتا ہوں کہ ایسی بے حیائی کی محفلیں قائم کر کے اپنے ایمان کی فروختگی سے باز آجائیں، لوگ ہماری قدر نہیں کر رہے ہیں، تو نہ کریں، ہم اپنی قدر خود تو کریں، ہم اپنے کو خود پہچانیں، ہماری اصل تصویر تو شرافت، انسانیت، ہمدردی اور غمگساری کی ہے، وفا ہماری فطرت میں شامل ہے، ان تمام چیزوں کی حفاظت بھی ہماری آئین ذمہ داری ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ ہم کو اللہ تعالیٰ راہِ راست پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

اصلاحِ معاشرہ (قسط دوم)

آثارِ قیامت

ازقلم: مفتی عبدالغفار صاحب قاسمی، مہتمم مدرسہ عربیہ انعام الحسن بنگلور

اس عنوان کی یہ دوسری قسط ہے، اس کی قسط اوّل پچھلے ماہ کے شمارہ میں شائع ہوچکی ہے، جس میں قربِ قیامت میں پیش آنے والی علاماتِ صغریٰ کا بیان تھا، اب اس قسط میں قیامت کی علاماتِ کبریٰ کو بیان کیا جائے گا ان شاءاللہ العزیز۔

حضرت حذیفہ بن اسید غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ بیٹھے ہوئے قیامت کا تذکرہ کررہے تھے کہ اچانک حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے، اور دریافت فرمایا کہ کیا بات چیت چل رہی تھی؟

تو ہم نے جواب دیا کہ ہم قیامت کا تذکرہ کررہے تھے، تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ''قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک کہ تم اس سے پہلے ان دس علامات کو نہ دیکھو (۱) دھویں کا چھاجانا (۲) دجال کا نکلنا (۳) زمین سے ایک جانور نکل کر لوگوں سے بات چیت کرے گا، جس کو دابۃ الارض کہا جاتا ہے (۴) سورج کا بجائے مشرق سے طلوع ہونے کے مغرب سے طلوع ہوکر مغرب ہی میں ڈوب جانا (۵) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نازل ہونا (۶) یاجوج ماجوج کا نکلنا (۷) مشرق میں زمین کا دھنسنا (۸) مغرب میں زمین کا دھنسنا (۹) جزیرۃ العرب میں زمین کا دھنسنا (۱۰) اور سب سے آخر میں یمن سے آگ کا نکلنا (یہ آگ لوگوں کو میدانِ محشر تک ہانک کر لے جائے گی)۔

علاماتِ قیامت میں سے ایک علامت دجال کا خروج ہے، حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک صبح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کا ذکر فرمایا، اور اس کے فتنہ کے نشیب وفراز بتائے، اس بیان سے (بوجہِ خوف کے) یوں لگا جیسے دجال قریبی نخلستان میں موجود ہو، ہم اس وقت تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے چلے گئے، جب شام کو آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے (خوف کی) اس کیفیت کو بھانپ لیا جو ہم پر طاری تھی، اور پوچھا تمہارا کیا حال ہے؟ ہم نے کہا یارسول اللہؐ! آپ نے صبح دجال کا ذکر فرمایا اور اس کے (فتنہ کے) نشیب وفراز بتائے، حتیٰ کہ ہمیں ایسا معلوم ہونے لگا کہ جیسے دجال قریبی نخلستان میں موجود ہو، یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے (امتِ محمدیہؐ کے) بارے میں مجھے دجال سے زیادہ دوسری چیز کا ڈر ہے (کیونکہ) اگر وہ میری زندگی میں نکلا تو تمہاری طرف سے اس کا مقابلہ کرنے والا میں

موجود ہوں، (لہٰذا تمہیں فکر کی ضرورت نہیں) اور اگر وہ اس زمانہ میں نکلا جبکہ مَیں تمہارے درمیان نہ ہوں گا (یعنی میری وفات کے بعد نکلا) تو ہر مردِ مسلم اپنا دفاع خود کرے گا، میرے بعد اللہ (تو) ہر مسلمان کا حامی و ناصر ہے ہی (دجال کی علامات اور حالات پھر سن لو) وہ جوان ہوگا، بال سخت پیچیدہ ہوں گے، اس کی آنکھ بے نُور ہوگی، میرے خیال میں عبدالعزیٰ بن قُطَن کے مشابہ ہوگا، تم میں سے جو دجال کو پائے وہ اس پر سورۂ کہف کی ابتدائی آیاں پڑھ دے، وہ شام و عراق کے درمیان ایک راستہ پر نمودار ہوگا، اور دائیں بائیں (ہر طرف) فساد پھیلائے گا، اے اللہ کے بندو! تم اس وقت ثابت قدم رہنا۔ ہم نے کہا یارسول اللہؐ! وہ دنیا میں کتنے عرصے رہے گا؟ آپؐ نے فرمایا: ''چالیس روز (جن میں سے) ایک دن ایک سال کے برابر اور ایک دن (یعنی دوسرا دن) ایک مہینہ کے برابر، اور ایک دن ایک ہفتے کے برابر ہوگا، اور باقی ایام عام دنوں کے برابر ہوں گے۔ ہم نے کہا یارسول اللہؐ! جو دن ایک سال کے برابر ہوگا اس میں ہمارے لیے کیا یک ہی دن کی نماز کافی ہوگی؟ آپؐ نے فرمایا: نہیں! (بلکہ) تم ہر وقتِ نماز کے لیے اس کی مقدار کا اندازہ کرلیا کرنا۔

ہم نے کہا یارسول اللہؐ! زمین پر اس کی رفتار کتنی تیز ہوگی؟ فرمایا: بارش (کے اُس بادل) کی طرح ہوگی جسے پیچھے سے ہوا ہانک رہی ہو۔ بس وہ ایک قوم کے پاس آئے گا اور انہیں دعوت دے گا (کہ اسے اپنا خدا تسلیم کرلیں) وہ لوگ اس پر ایمان لے آئیں گے، اور اس کی بات مان لیں گے، پس وہ بادلوں کو حکم کرے گا تو بادل بارش برسائیں گے، زمین کو حکم دے گا تو وہ (نباتات) اُگائے گی؛ چنانچہ ان کے مویشی (اُونٹ وغیرہ جو صبح چَرنے گئے تھے) شام کو اس حالت میں لوٹیں گے کہ ان کے کوہان خوب اُنچے، تھن لبریز اور کوکیں بھری ہوئی ہوگی، پھر ایک قوم کے پاس آکر ان کو (اپنے باطل دعوے کی طرف) بلائے گا، وہ اسے رَد کردیں گے، تو دجال وہاں سے چلا جائے گا؛ مگر یہ لوگ صبح کو اس حالت میں اُٹھیں گے کہ ان میں قحط پھیل چکا ہوگا، ان کے اموال میں سے ان کے پاس کچھ نہ بچے گا اور دجال ایک ویران زمین سے گزرے گا تو اس سے کہے گا: ''اپنے خزانے اُگل دے''، تو زمین کے خزانے (نکل کر) اس کے پیچھے اِس طرح چلیں گے جیسے شہد کی مکھیاں اپنے بادشاہ کے پیچھے چلتی ہیں۔

پھر وہ ایک پُر شباب نوجوان کو بلائے گا اور اُسے تلوار مار کر دو ٹکڑے کردے گا، اور دونوں ٹکڑوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہوجائے گا جتنا تیر میارنے والے اور اس کے نشانہ کے درمیان ہوتا ہے، پھر وہ اس نوجوان کو آواز دے گا، پس وہ جوان (زندہ ہوکر) ہنستا ہوا پُر رونق چہرے کے ساتھ اس کی طرف بڑھے گا، ابھی یہ اسی (قسم کے) حال میں ہوگا کہ اللہ تعالیٰ مسیح ابنِ مریم علیہ السلام کو بھیج دیگا (جن کی تفصیل یہ ہے کہ) وہ دمشق کے مشرقی جانب سفید منارے کے پاس نزول فرمائیں گے، اس وقت ہلکے زرد رنگ (نیلے رنگ) کے دو کپڑوں میں (ملبوس)

ہوں گے، اور اپنے دونوں ہاتھ دو فرشتوں کے بازوؤں پر رکھے ہوئے ہوں گے، جب سر جھکائیں گے تو اس سے (پانی کے) قطرات ٹپکیں گے اور جب سر اُٹھائیں گے تو اس سے ایسے قطرے گریں گے جو چاندی کے دانوں کی طرح (چمکدار) اور موتیوں کی طرح (سفید) ہوں گے، آپ کے سانس کی ہوا جس کافر کو لگے گی اُسی وقت مَر جائے گا، اور جہاں تک آپؑ کی نظر جائے گی وہیں تک آپؑ کا سانس پہنچے گا، پس عیسیٰ علیہ السلام دجال کو تلاش کریں گے، حتیٰ کہ اسے لُدّ کے دروازے پر جالیں گے اور قتل کر ڈالیں گے۔

پھر عیسیٰ علیہ السلام کے پاس وہ لوگ آئیں گے جن کو اللہ نے دجال (کے دھوکہ وفریب) سے محفوظ رکھا ہوگا، تو آپؑ ان کے چہروں سے (غبارِ سفر یا آثارِ رنج ومصیبت کو) پونچھ دیں گے، اور جنت میں ان کے درجات (عالیہ) کی خوش خبری سنائیں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی طرح کے حالات میں ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ ان کے پاس وحی بھیجے گا کہ اب مَیں نے اپنے ایسے بندوں (یاجوج وماجوج) کو نکالا ہے، جن سے لڑنے کی طاقت کسی میں نہیں ہے؛ لہٰذا آپ میرے خاص بندوں (مؤمنین) کو کوہِ طور پر جمع کر لیجیے (عیسیٰ علیہ السلام ایسا ہی کریں گے) اور اللہ تعالیٰ یاجوج اور ماجوج کو (اتنی بڑی تعداد میں) بھیجے گا کہ وہ ہر بلندی سے (اُتریں گے اور تیز رفتاری کے باعث) پھسلتے ہوئے (معلوم) ہوں گے، جب ان کا پہلا حصہ بحیرۂ طبریہ سے گزرے گا تو اس کا سارا پانی پی کر ختم کر دے گا، اور جب ان کا آخری حصہ وہاں سے گزرے گا تو کہے گا یہاں کبھی پانی تھا۔

اللہ کے نبی عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی (کوہِ طور میں) محصور ہو جائیں گے (اور اشیاءِ خورد ونوش کی قلت کے باعث) یہ نوبت آجائے گی کہ ایک بیل کے سر کو سو دینار (اشرفیوں) سے بہتر سمجھا جائے گا، اب اللہ کے نبی عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی اللہ تعالیٰ سے دعا کریں گے، پس اللہ ان کے اُوپر (وبا کی صورت میں) ایک کیڑا مسلّط کر دے گا جو ان کی گردنوں میں پیدا ہوگا، اس سے سب کے جسم پھٹ جائیں گے، اور سب کے سب دفعۃً ہلاک ہو جائیں گے۔

پھر اللہ کے نبی عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی (جبلِ طور سے) زمین پر اُتریں گے، تو انھیں زمین پر بالشت بھر جگہ بھی ایسی نہ ملے گی جسے یاجوج وماجوج (کی لاشوں) کی چکنائی اور تعفّن نے بھر نہ دیا ہو، اب اللہ کے نبی عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی (پھر) اللہ سے دعا کریں گے، جس کے نتیجہ میں اللہ ایسے (بڑے بڑے) پرندے بھیجے گا جن کی گردنیں بختی اُونٹ کی گردنوں کی طرح ہوں گی، یہ پرندے اُن کی لاشوں کو اُٹھا کر جہاں اللہ چاہے گا پھینک دیں گے۔

جاری.....

تذکرۂ اولیاءؒ

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

از قلم: مولانا محمد عمرین محفوظ رحمانی صاحب، سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

تاریخ ۳۱؍دسمبر تھی اور دن جمعہ کا، جب مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے داغ مفارقت دیا، عمر طبعی اور اقدام وعمل سے لبریز زندگی گزار کر وہ ایسے وقت رخصت ہوئے، جب گزشتہ صدی کا چراغ بھی گل ہوا چاہتا تھا، اس مناسبت اور طویل ترین خدمات کے پیش نظر انہیں ''صدی کی شخصیت'' بھی کہا جاتا ہے، اور یہ لقب ان پر جچتا ہے، انہیں زیب دیتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ۱۷؍سال بیت گئے، حضرت مولانا کے وصال کے وقت جو بچے تھے، آج جوان ہیں، اور جو جوان تھے، اب ادھیڑ عمری کے مرحلے سے گزر رہے ہیں اور ''لوٹ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو'' کی حسرت آمیز صدا بلند کر رہے ہیں۔ جو جوان نسل ہمارے سامنے ہے، ان میں سے بہت سوں نے حضرت مولانا کو دیکھا نہیں، انہیں میں سے ایک راقم الحروف بھی ہے، لیکن اگر یہ بات سچ ہے اور یقیناً سچ ہے کہ ''در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل'' تو پھر یقین مانیے کہ میں نے انہیں دیکھا ہے، اور خوب دیکھا ہے، اور تعلّی نہ سمجھی جائے تو عرض کروں کہ بہت سے دیکھنے والوں سے بڑھ کر دیکھا ہے، اس لیے کہ حضرت مولانا کی کتابیں، ان کی گراں قدر تصنیفات پڑھنے کا خوب موقع ملا اور وہ بھی اس دور میں جب کہ قلب وذہن کی تختی بالکل سادہ تھی، اس پر نہ کوئی نقش کندہ تھا اور نہ کسی مصنف ومفکر کی چھاپ پڑی تھی۔ ابتدائے شعور کے زمانے میں انہیں پڑھا اور خوب پڑھا اور ذہن ودل نے اس کے اچھے اثرات قبول کیے۔

اللہ بخشے والد مرحوم کو، وہ کتابوں کے رسیا تھے، مطالعہ کے شوقین، اور کتابوں کے انتخاب میں بڑے محتاط اور باریک بین، وہ کتاب کے دیدہ زیب اور جاذب نظر سرورق یا دبیز اور خوشنما صفحات دیکھ کر کتاب نہیں خریدتے تھے، کتاب خریدنے کے سلسلے میں ان کا معیار اونچا تھا اور میزان مبنی بر عدل، سطحی فکر ونظر رکھنے والے کسی مصنف کی کتاب یا مشہور مصنف کی ہلکے درجے کی تصنیف ان کے کتب خانے میں بار نہیں پا سکتی تھیں، بھرتی کی کتابوں کو ہاتھ لگانا وہ مکروہ تحریمی خیال کرتے تھے، اس میں ان کی محتاط طبیعت کو بھی دخل تھا اور قوت خرید کی کمی بھی اس کا بڑا سبب تھی! والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی انتخاب کردہ معیاری کتابوں کے ذخیرے میں حضرت مولانا کی متعدد

تصنیفات تھیں، جب میرے مطالعہ کا سفر شروع ہوا تو حضرت مولانا کی کتابیں پڑھنے کی عزت وسعادت حاصل ہوئی، تذکرہ وسوانح کی کتابیں پڑھنے کا مجھے بچپن سے شوق ہے؛ اس لیے پہلے زیادہ تر وہ کتابیں پڑھیں جن کا تعلق تذکرہ اور سوانح سے ہے، جیسے سوانح حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ، تاریخ دعوت وعزیمت وغیرہ۔

اب تک خوب یاد ہے کہ اسی دور میں محلے کی مسجد میں ایک رات ''تذکرہ شاہ فضل رحمانؒ'' کا مطالعہ کیا، عشاء کے کچھ دیر کے بعد مطالعہ شروع کیا، اور جب تہجد سے گھنٹہ بھر پہلے مطالعہ سے فارغ ہوا تو دل صاحب تذکرہ کی عقیدت سے لبریز تھا، اور مصنف کی محبت سے نگاہ ونظر روشن، کتاب پڑھتے ہوئے متعدد مرتبہ آنکھیں چھلک پڑیں، خاص طور پر حضرت شاہ فضل رحماں گنج مرادآبادیؒ کے وصال کے حالات پڑھتے ہوئے، کتاب کا یہ حصہ موثر بھی ہے اور ایمان افروز بھی!

بعض چیزیں لوح دل پر اس طرح نقش ہو جاتی ہیں کہ مٹائے نہیں مٹتیں اور بھلائے نہیں بھولتیں، ''تذکرہ شاہ فضل رحمانؒ'' پڑھ کر جو کیفیت ہوئی تھی اب بھی اس طرح یاد ہے جیسے کل کی بات ہو، مطالعہ سے فارغ ہو کر تہجد پڑھی، اور صلوۃ الحاجت پڑھ کر دعا مانگی کہ خداوندا اس ظلوم وجہول کو، اس ناکارہ اور بے مایہ کو بھی اپنے اچھے بندوں کی جماعت میں داخل اور تیرے چاہنے والوں میں شامل کر اور خاصان خدا کے نقش قدم پر چلا، کیا عجب کہ یہ دعائے نیم شبی عاجز وفقیر کے لیے حضرت شاہ فضل رحماں قدس سرہ کے سلسلہ عالیہ تک پہونچنے کا ذریعہ بنی ہو!

تذکرہ اور سوانح کی کتابوں کے بعد حضرت مولانا کی علمی وفکری کتابوں کا مطالعہ کیا، اور جوں جوں مطالعہ کرتا گیا حضرت مولانا کے تئیں محبت کا جذبہ بھی پروان چڑھتا گیا۔ ؎

اتانی هواها قبل ان اعرف الهویٰ
فصادف قلباً خالیا فتمکنا

نوعمری میں حضرت مولانا کی کتابیں اور ان کے بارے میں لکھے گئے مضامین پڑھ کر اور اپنے اساتذہ کرام سے ان کے محاسن اور کمالات سن کر میرے دل پر جو تاثر قائم ہوا، سچی بات عرض کروں تو وہ تأثر عظمت کا نہیں محبت کا تھا، شدید ترین محبت، اور محبت بھی کیا خوب شئے ہے۔ ع

سمٹے تو دل عاشق پھیلے تو زمانہ ہے

اسی محبت نے حضرت مولانا کی شخصیت کو ایک آئیڈیل شخصیت کا روپ بخش دیا اور ایک طالب علم کا دل یہ آرزو کرنے لگا کہ میں بھی ان کی راہ پر چلوں، ان کے نقش قدم کو اپناؤں اور ان کے فکر ونظر کو دل میں بساؤں، یہی زمانہ تھا جب درجے میں سبق کے بعد استاذ نے پوچھا: ''اپنے اپنے آئیڈیل کے بارے میں بتاؤ!'' طلبہ نے

جواب دینا شروع کیا، ہوتے ہوتے جب ایک دیوانے کی باری آئی تو وہ بے ساختہ کہہ اٹھا: ''مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ''! کچے ذہن کی خواہش اور امنگ کہہ لیجیے یا پھر دیوانے کا خواب! مگر محبت کی شدت نے جو کہلوایا تھا، آج صفحہ قرطاس کے سپرد کر رہا ہوں، ویسے بھی خواب دیکھنے میں حرج نہیں، تمنا پر پابندی نہیں، اور خواہش پر نہ خراج عائد ہوتا ہے اور نہ ٹیکس واجب! اس لیے اگر ایک نوعمر طالب علم نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر کوئی تمنا کر بھی دی تو کون سی قیامت برپا ہوگئی، مجھے صرف یہ بتانا تھا کہ اس دور میں حضرت مولانا کی محبت کا کیسا انمٹ نقش دل پر قائم ہوا، اور ان کی ذات گرامی سے شیفتگی کی کیسی مضبوط بنیاد پڑی۔ ع

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل است

پھر جب سن کچھ اور بڑھا اور حضرت مولانا کی ہمہ جہت شخصیت کے مختلف پہلو سامنے آئے، ان کے کمالات سے آشنائی ہوئی، ان کی خوبیوں کا علم ہوا، تو ان کی عظمت اور قدر و منزلت دل میں پیدا ہوئی، اور یہ محسوس ہوا کہ حضرت مولانا صرف مفکر و مصنف، ادیب و خطیب، قائد و رہبر اور عالم و منتظم ہی نہیں ہیں؛ بلکہ ''ماورائے سخن بھی کوئی بات'' ان کی شخصیت میں ہے، جس نے انہیں جاذبیت اور دلکشی عطا کی ہے، اور محبوبیت و مقبولیت کے مقام بلند پر فائز کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ جب کبھی اور جہاں کہیں ان کا تذکرہ نکلتا ہے محفل معطر ہو جاتی ہے، ذہن منور ہو جاتا ہے، قلوب عظمت سے معمور ہو جاتے ہیں، اور دور کہیں اقبال یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں ع

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

حضرت مولانا علم و فضل، اخلاق و کردار، زہد و استغنا اور تقویٰ و طہارت میں اسلاف کا نمونہ تھے، پاک طینت، صاف باطن، بیدار مغز، بالغ نظر اور قیادت کی تمام خوبیوں اور صفات سے بہرہ ور، وہ نگاہ بلند، سخن دل نواز اور جاں پرسوز کے مالک تھے، اور قلب دردمند، فکر ارجمند اور زبان ہوش مند کے حامل! حق بات کا اظہار کرنے والے، باطل افکار و نظریات پر بے لاگ تنقید کرنے والے، اعتدال پسند، صاحب مروت، اور مختلف اور متضاد عناصر کو جمع کرنے کی بے پناہ صلاحیت رکھنے والے، بولتے تو موتی رولتے تھے، لکھتے تو الفاظ کا تاج محل تیار کرتے، روشن، منور، اور جاذب قلب و نظر! شورش کاشمیری مرحوم کے بقول ''وہ حجازی لَے کے ہندوستانی خطیب تھے'' تحریر بھی ایسی شاداب اور شگفتہ کہ جو پڑھنا شروع کرے پڑھتا چلا جائے، الفاظ کا انتخاب ایسا اور اتنا عمدہ کہ بڑے بڑے ادیب ششدر و حیران رہ جاتے، عربی اور اردو دونوں زبان میں ان کی تحریریں، تصنیفات، مضامین اور مقالات زبان و ادب کا سرمایہ ہیں، بیش قیمت بھی بلند پایہ بھی!

امیر شریعت حضرت مولانا محمد ولی رحمانی دامت برکاتہم (جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ) کے جادو نگار قلم نے حضرت مولانا کی تحریر کی عمدگی کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

''حضرت مولاناؒ کی تحریریں پڑھ جایئے۔ وہ دماغ کو مجبور نہیں کرتے، دلیل کے سامنے چپ کر دینے والا انداز نہیں اپناتے، ان کی کوشش ہوتی ہے کہ قرآن و حدیث سے، بزرگوں کی سیرت و سوانح سے، لفظی نکتوں اور ادبی جہتوں سے اور سوز دروں سے دلوں کو چھولیا جائے، اور دل کی امانت سینوں میں اتار دی جائے؛ اس لیے ان کا قاری چمنستانِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم اور بہارستان اسلامی میں محوخرام رہتا ہے، ذہنی دباؤ سے دور، فکری تشنج سے پرے، بات دل میں اترتی چلی جاتی ہے، آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ''از دل خیزد بر دل ریزد'' والی بات ہے! مجھے احساس شکر کے ساتھ اعتراف نعمت ہے اور جرأت اظہار بھی کہ میں حضرت مولاناؒ کی تحریروں سے بہت متاثر ہوں، میرا احساس ہے، کہ لال قلعہ کی عظمت، تاج محل کا حسن، قطب مینار کی بلندی، کلیوں کا بانکپن، گلوں کی نرمی، پھلوں کا رس، شہد کی مٹھاس، گنگا کا بہاؤ، کوسی کا کٹاؤ، حقیقتوں کی لہریں، ایمان کی چاشنی اور یقین کی پختگی کو آب زمزم سے دھوکر لفظی آہنگ اور کاغذی پیرہن دے دیا جائے، تو وہ حضرت مولاناؒ کی تحریر بن جائے گی۔ یہ ذخیرۂ الفاظ کا بیجا استعمال نہیں، احساس کی ترجمانی ہے، ان کی تحریروں کو پڑھ جایئے، نہ جانے کتنی جگہ دامن دل کھنچ کھنچ جاتا ہے، کتنے جملے دل میں اترتے چلے جاتے ہیں، چھوٹے رسائل ہوں یا ضخیم کتابیں، حضرت مولاناؒ کا پر بہار طرز اور سدا بہار صوتی آہنگ ہر جگہ چھایا رہتا ہے، اور ذوق سلیم محسوس کرتا ہے کہ کلامِ الٰہی اور کلامِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ میں مطالعہ کا سفر ہو رہا ہے۔''

حضرت مولانا عالمی شخصیت تھے، عرب وعجم نے ان سے استفادہ کیا، ان کی تحریوں کے اقتباسات خانہ کعبہ کے زیر سایہ دیئے جانے والے جمعہ کے خطبوں میں نقل کئے گئے، عربی النسل ائمۂ حرم اور علمائے عرب نے ہندوستان کے ایک چھوٹے سے گاؤں (''دائرہ شاہ علم اللہ'' رائے بریلی) سے تعلق رکھنے والے عجمی عالم کی تصنیفات کو سرمۂ بصیرت و بصارت جانا، ان کے افکار ونظریات اور زبان وادب دونوں سے خوشہ چینی کی، اور کھلے دل سے اس بات کا اعتراف کیا کہ یہ شخص اپنی خداداد صلاحیت وصالحیت کے اعتبار سے بے نظیر ہے۔ حضرت مولانا نے اپنے عہد شباب میں ''**ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین**'' لکھی، یہ کتاب جہاں پہونچی اس نے اپنا اثر چھوڑا، بڑے بڑوں نے داد دی، اصحاب فکر ونظر اور ارباب قرطاس وقلم نے لکھنے والے کی مہارت اور اس کے پر تاثیر قلم کو خراج عقیدت پیش کیا، یہ کتاب کل بھی زندہ اور تازہ تھی اور آج بھی سرسبز وسدا

بہار، عطر بیز اور مشکبار ہے، گل نوشگفتہ اور بادنسیم کی طرح! والد مرحوم فرماتے تھے: ''عرب نے عجم سے بڑھ کر حضرت مولانا کی قدر کی، انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا، اور ان کے افکار ونظریات سے بھرپور استفادہ کیا۔'' حضرت مولانا نے بھی اس قدر شناسی اور قدر افزائی کا حق ادا کیا، اکثر وبیشتر عربی زبان کو اپنے علوم ومعارف اور افکار ونظریات کے اظہار کا ذریعہ بنایا، اور ہر مرحلے میں عربوں کے خیر خواہ اور ناصح رہے، اس حقیقت کا اظہار خود ان کے پرشکوہ الفاظ میں سنیے:

''میں نہ عربی دنیا سے بیگانہ اور اجنبی ہوں، نہ میری معلومات سکنڈ ہینڈ ہیں، اور نہ میں نے عرب رہنماؤں پر تنقید کا کام اور عربوں کی زندگی کے احتساب کا فریضہ، ان کے مصائب اور ان کی ناکامیوں کے اسباب پر بحث کا سلسلہ صرف عرب واسرائیل کی اس جنگ کے موقع پر شروع کیا ہے، اور نہ میں اچانک اور بے وقت اس میدان میں آ گیا ہوں، میں اپنے آپ کو (ایک مسلمان کے رشتے سے بھی اور عربی ثقافت کے ناطے سے بھی) اس وسیع وعظیم عرب خاندان کا ''جو مراکش سے بغداد تک پھیلا ہوا ہے'' ایک فرد سمجھتا ہوں، میں ان کے دکھ سکھ میں شریک ہوں، میری قسمت ان کی قسمت سے وابستہ ہے، ان کی عزت سے میری عزت اور ان کی ذلت سے میری ذلت ہے، میرے تخیلات کی دنیا، میری تمناؤں کا مرکز، میرے طائر روح کا حقیقی نشیمن، عرب کی محبوب سرزمین، اس کی زبان وادب اور اس کی تہذیب وثقافت رہی ہے، عربی دنیا کے اس پورے اثاثہ اور سرمایہ پر (جس کی حفاظت اور سربلندی کے لیے قومیت عربیہ کا نعرہ بلند کیا جاتا ہے) میرا حق کسی طہ حسین، کسی عقاد، کسی احمد امین یا کسی کرد علی سے کم نہیں، میرا خمیر اور میرا آب وگل ہندوستان کی سرزمین سے ہے، مجھے اس کا اعتراف بھی ہے، اس پر فخر بھی؛ لیکن میں نے اردو سے زیادہ عربی زبان کو اپنے اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا، اور مجھے اقبال کے الفاظ میں یہ دعوی کرنے کا حق ہے کہ:'' ع

میرا ساز گرچہ ستم رسیدہ زخمہائے عجم رہا
وہ شہید ذوق وفا ہوں کہ نوا میری عربی رہی

ماضی قریب میں عربوں کو ان کا اصل اور صحیح مقام دلانے اور مال وجاہ کے فتنوں سے محفوظ رکھنے کی جو کوششیں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہیں، ان میں ان کا کوئی ہمسر اور شریک نظر نہیں آتا، حضرت مولانا نے ہمت وحکمت کے ساتھ اور دعوت واصلاح کے قرآنی ونبوی اصول کی بھرپور رعایت کرتے ہوئے ہر موقع پر عربوں کو ان کا اصل مقام یاد دلایا، عظمت رفتہ کی طرف لوٹنے کی تلقین کی، قومیت عربیہ کے نقصانات، اور مال

وجاہ کی طرف سبقت ورغبت کے تباہ کن اثرات سے واقف کرایا، عربوں کے پورے احترام عظمت اور راہ دین میں ان کی جانب سے پیش کی جانے والی تمام جانی، مالی قربانیوں کی پوری قدر شناسی، اور اسلام کی تبلیغ اور نشر واشاعت کے سلسلے میں ان کی قابل قدر کوششوں کے اعتراف کے ساتھ ان کے قلم وقدم کی لغزش، فکر ونظر کے فساد، معدہ ومادہ کی بڑھتی ہوئی پرستش، اور عیاشی کی حدوں کو چھوتی ہوئی آسائش پر بروقت اور برملا تنقید کی، اور اسلام کی طرف از سر نو لوٹنے اور ذہن ودل کو محبت الٰہی اور حب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے سرشار کرنے کی دعوت دی، اور انہیں اقبال کے الفاظ میں بار بار اس حقیقت سے روشناس کرایا کہ ؎

نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا
محمد عربی سے ہے عالم عربی

حضرت مولانا نے عربوں سے بار بار بغیر کسی لاگ لپٹ کے یہ فرمایا تھا:

''اس سرزمین پر میری نگاہ میں سب سے زیادہ قابل احترام قوم عرب ہیں اور اگر مجھے کسی قسم کی لاگ لپیٹ، بے جا مراعات اور رواداری کا لحاظ رکھنا ہی ہوتا تو میں عرب کے ساتھ یہ رویہ اپناتا؛ لیکن میں اسے اخلاقی جرم باور کرتا ہوں اور پوری ملت اسلامیہ کے حق میں اسے ایک بڑی خیانت تصور کرتا ہوں، میرا ذہن وعقیدہ اور مذہب ومسلک مجھ سے صدق اور راستی اور حق گوئی وبے باکی کے التزام کا مطالبہ کرتا ہے، میرا ضمیر اور امت اسلامیہ عربیہ سے میرا دینی، نسبی اور تہذیبی اٹوٹ رابطہ میرے ذمہ وفاداری، دیانت و پاکیزگی اور برملا اعلان حق کے فرائض عائد کرتا ہے، میں یہ سمجھتا ہوں اور اس میں حق بجانب بھی ہوں کہ عرب ہی پیغام اسلام کی امانت اور ذمہ داری اٹھانے اور نبھانے کے سب سے زیادہ مستحق ہیں، انہیں جو عزت بھی نصیب ہے، وہ اسلام کا اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض ہے، اسلام ہی اگر ان سے چھن جائے تو پھر ان کے پاس کچھ بھی باقی نہیں بچتا، اسلامی صلابت اور دینی غیرت کا مطلوبہ معیار پورا کرنے پر عرب یقیناً سب سے زیادہ مستحق قیادت ہیں، انہیں اپنا یہ منصب سنبھالنا چاہیے۔''

حضرت مولانا کی کتابیں ''**كيف دخل العرب التاريخ**'' اور ''**أسمعوها مني صريحة ايها العرب**'' وغیرہ اس بات کی شاہد ہیں کہ حضرت مولانا نے عربوں کے سامنے اپنا دل نکال کر رکھ دیا اور انہیں ان کے اصل خطرات سے آگاہ کیا جو ان کے اور دین وشریعت کے لیے سخت نقصان دہ ثابت ہو سکتے تھے، مادہ پرستی، عیش پسندی اور منصب وجاہ کی ہوس کے نتیجہ میں آنے والی جن آفتوں سے اس مرد درویش نے ڈرایا تھا، کل تک

اگر وہ پردے کے پیچھے تھیں تو آج نگاہوں کے سامنے ہیں اور یہ احساس دلا رہی ہیں کہ ع

قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید

ضرورت چہ معنی، شدید ضرورت ہے کہ حضرت مولانا کے پیغام کو عالم عرب میں زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے، اور انہیں پوری دلسوزی کے ساتھ بتادیا جائے کہ مسافر جس کشتی میں سوار ہوں، اسی میں سوراخ کرنے کا نتیجہ سوائے ہلاکت کے کچھ بھی نہیں۔

سوچتا ہوں کہ آج اگر حضرت مولانا زندہ ہوتے اور انہیں مرکز اسلام میں سینما ہال کے کھلنے کی خبر ملتی، ''معتدل اسلام'' کا نعرہ سنائی دیتا، اہل حق علماء کی گرفتاری کی اطلاع ہوتی تو ان کی فکرمندی کا کیا عالم ہوتا؟ ان کا درد اور سوز کن الفاظ میں ظاہر ہوتا اور وہ اس صورت حال کی تبدیلی کے لیے کس قدر کوشاں ہوتے؟ پھر یہ خیال بھی آتا ہے کہ ہماری بے حسی، بے عملی اور بزدلی پر ان کی نظر پڑتی تو کیا وہ یہ سوچنے میں حق بجانب نہ ہوتے کہ یہ جرأت مند انسانوں کی ناخلف اولادیں ہیں، جن کے ضمیر افسردہ اور دل مردہ ہوئے جارہے ہیں، اور جن کے زبان وقلم پر درہم ودینار کی مہر لگ چکی ہے اور جنہوں نے ''بزدلی'' کو ''مصلحت'' کا خوشنما نام دیدیا ہے۔ع

غیرت ہے جس کا نام گئی تیمور کے گھر سے

حضرت مولانا نے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جو علم وفضل کا امین تھا اور تقویٰ وطہارت اور خوف و خشیت میں ممتاز بھی! ان کے والد مولانا حکیم عبدالحئی رحمۃ اللہ علیہ اپنے دور کے عظیم شیخ طریقت حضرت مولانا شاہ فضل رحماں گنج مرادآبادی قدس اللہ سرہ کے دست گرفتہ اور فیض یافتہ تھے، ان کی والدہ خیرالنساء بہتر صاحبہ شاہ ضیاء النبی نوراللہ مرقدہ، جیسے عظیم المرتبت اور صاحب نسبت بزرگ کی صاحبزادی تھیں اور خود بڑی صالحہ اور صاحب ذوق وحال خاتون! ایسے پاکیزہ ماں باپ کی گود میں پرورش پانے والا بچہ ذکر وفکر، طاعت وعبادت اور خشیتِ الٰہی ومحبت نبوی کی دولت کیوں نہ پاتا، پھر آگے چل کر انہیں جو اساتذہ ملے وہ بھی تزکیہ واحسان میں ممتاز تھے، انہوں نے حدیث شریف کا علم جن اساتذہ کرام سے حاصل کیا، ان میں سے دو اساتذہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نوراللہ مرقدہ کے فیض یافتہ تھے، ندوۃ العلماء میں حضرت مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ اور دارالعلوم دیوبند میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، جن مشائخ سے ان کا اصلاح وتربیت کا تعلق قائم ہوا اور جن کے سلاسل تصوف میں انہیں اجازت وخلافت حاصل ہوئی، ان میں ان کے پہلے شیخ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ مجاہدہ وریاضت میں بے مثال اور دوسرے شیخ حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ تواضع اور عبدیت میں بے نظیر تھے، ان کے علاوہ متعدد بزرگوں، اصحاب نسبت اور اہل دل

ہستیوں کی معیت وصحبت، ان کی بزرگانہ اور مقبول دعائیں حضرت مولانا کو حاصل ہوئیں اوران دعاؤں کی برکت اور خود ان کے ذاتی مجاہدہ اور محنت نے انہیں روحانیت کے بڑے اونچے مقام پر فائز کردیا تھا، اخفائے حال کا غلبہ تھا، اس لیے مجالس میں نہ کیفیات کا ذکر آتا، نہ کرامتوں کا تذکرہ ہوتا، لیکن ان کی تحریر وتقریر میں روحانی کیفیات اس طرح رچ بس گئی ہیں، جیسے شاخ گل میں بادسحرگاہی کانم! اسی کا اثر ہے کہ ان کی بعض کتابیں پڑھتے ہوئے آنکھیں اشکبار اور دل بے قرار ہوجاتا ہے، مثلاً ''الطریق الی المدینة'' یا اردو میں'' کاروانِ مدینہ'' کتاب کیا ہے؟ عشق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا منہ بولتا ثبوت اور ایک چاہنے والے کا اپنے محبوب کی بارگاہ میں بہترین خراج عقیدت ومحبت! جسے حب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے سرشار ہونا ہو، اسے یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیے، یہ کتاب آپ کا تھوڑا سا وقت ضرور لے گی؛ مگر بدلہ میں عشق رسالت اور محبت نبوی کی لازوال دولت دے جائے گی، کیا عجب کہ اس کتاب کی تصنیف کے دوران حضرت مولانا راتوں کی تنہائی میں بارگاہ رب العزت میں دست بدعا ہوکر محسن کاکوروی کے الفاظ میں یہ التجا پیش کرتے ہوں ع

صف محشر میں ترے ساتھ ہو تیرا مداح
ہاتھ میں یہی مستانہ قصیدہ یہ غزل
کہیں جبرئیل اشارے سے ہاں! بسم اللہ
سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل

حضرت مولانا دارالعلوم ندوۃ العلماء جیسے شہرہ آفاق اور وسیع ادارے کے ناظم اعلیٰ تھے، ایک بڑے خانقاہی نظام سے وابستہ تھے، ممتاز مصنف تھے، باکمال خطیب، اور بالغ نظر مفکر تھے، ان تمام خوبیوں کے ساتھ ان کا یہ وصف بھی لائق ستائش ہے کہ وہ تاعمر ملی مسائل سے جڑے رہے، نہ مدرسے کی ذمہ داریوں کو انہوں نے قدموں کی زنجیر بننے دیا، نہ خانقاہی نظام کے حوالے سے خلوت کی راہ تلاش کی، نہ تصنیفی اور خطابتی سرگرمیوں کو ڈھال کے طور پر استعمال کیا، جب کبھی ملت پر حالات آئے، مصائب کی بدلیاں چھائیں، مشکلات کے طوفان اٹھے، حضرت مولانا پورے عزم وحوصلے کے ساتھ سامنے آئے، اور ملت اسلامیہ کی رہنمائی کی، آل انڈیا دینی تعلیمی کونسل، مسلم مجلس مشاورت، تحریک پیام انسانیت اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی تاریخ گواہ ہے کہ ملی مسائل کے حل کے لیے حضرت مولانا ہردم اور ہمہ وقت تیار رہے اور جو کچھ ان سے بن پڑسکتا تھا، انہوں نے کیا، حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بعد وہ باتفاق رائے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر بنائے گئے، ان کا عہد صدارت ۲۸/دسمبر ۱۹۸۳ء سے ۳۱/دسمبر ۱۹۹۹ء تک ہے،

مدت صدارت ۱۶؍سال بنتی ہے، اس لانبے عرصے میں سرد وگرم مرحلے گزرے، قیادت کا امتحان بھی ہوا، اور بورڈ کی اجتماعیت بھی خطرے میں پڑی؛ مگر حضرت مولانا نے ہر مرحلہ میں قیادت کے منصب کو داغدار ہونے سے بچایا اور اپنی حکمت عملی اور مناسب اقدام کے ذریعے ملت اسلامیہ کو سہارا دیا، یہ بھی ان کی عظمت کا ایک رخ ہے کہ اگر انہیں یہ محسوس ہوا کہ کہیں کوئی غلطی ہوگئی ہے تو کھلے دل سے اس کا اعتراف کیا، عام حالات میں قیادت کٹھن کام نہیں ہے لیکن جب چاروں طرف سے مخالفت کی جارہی ہو اور سفینہ ملت گرداب میں آچکا ہو، اس وقت قیادت ''کارے شیشۂ وآہن'' ہے، حضرت مولانا اس مرحلے سے بھی گزرے اور کامیاب گزرے، شاہ بانو کا مسئلہ انہی کے عہد صدارت میں کھڑا ہوا، انہوں نے اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے بانی اور اس کے اولین جنرل سکریٹری حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ نے پورے ملک کے مسلمانوں کو تحفظ دین وشریعت کے لیے جان کی بازی لگانے پر آمادہ کرلیا، یہ ان کی قائدانہ صلاحیت اور مسلمانوں کے اتحاد اور یکجہتی کا ثمرہ تھا کہ آدھی رات بیت جانے کے بعد پارلیمنٹ کا اجلاس بلایا گیا، اور مسلمانوں کے مطالبے کے مطابق عدالتی فیصلے میں ترمیم کی گئی، حضرت مولانا نے اس سلسلے میں متعدد مرتبہ اس وقت کے وزیر اعظم راجیو گاندھی سے ملاقات کی، اور مسلمانوں کا درد ان کے سامنے رکھا۔

ایسے ہی کسی ملاقات کے لیے کیے جانے والے سفر کا واقعہ ہے کہ لکھنو اسٹیشن پر حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ سے پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق حضرت مولانا کی ملاقات ہوئی، دونوں دوستوں کے درمیان کچھ مشورہ ہوا، اور پھر جب ملاقات ختم ہوئی تو حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ جانے والوں نے (جو کچھ دور پر کھڑے ہوئے تھے) دیکھا کہ حضرت مولانا نعمانی بے چین ہوکر کبھی صدری کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہیں، کبھی کرتے کی جیب ٹٹولتے ہیں، جب حضرت مولانا علی میاں روانہ ہوگئے اور مولانا نعمانی واپس آئے تو ہمراہیوں نے پوچھا کہ حضرت! آپ کی کوئی چیز گم ہوگئی ہے؟ آپ بڑی بے چینی سے جیبیں ٹٹول رہے تھے، تو مولانا نعمانی آنسوؤں سے رو پڑے اور فرمایا نہیں، کوئی چیز گم نہیں ہوئی؛ بلکہ ہوا یہ کہ جب ہم دونوں (مولانا علی میاں، اور مولانا محمد منظور نعمانی نور اللہ مرقدھما) کا مشورہ مکمل ہوگیا تو مولانا علی میاں نے مجھ سے کہا کہ اگر آپ کے پاس کچھ پیسے ہوں تو مجھے قرض دے دیجیے، دہلی سے واپسی کا کرایہ میرے پاس نہیں ہے، مولانا نعمانی نے مزید یہ بھی کہا کہ ''دیکھو اس شخص کو کروڑوں مسلمانوں کا نمائندہ بن کر ملک کے وزیر اعظم سے ملنے جارہا ہے اور واپسی کا کرایہ تک پاس میں نہیں ہے۔'' یہ بھی ایک رخ ہے حضرت مولانا کی زندگی کا! اور اسی لیے ان کو حق تھا کہ وہ یہ کہتے:

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں
غلام طغرل و سنجر نہیں میں
جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن
کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

بات دور نکل گئی، ذکر چل رہا تھا شاہ بانو تحریک کا، اور حضرت مولانا کی قائدانہ صلاحیت کا، انہی کے دور صدارت میں وندے ماترم کا معاملہ بھی یوپی گورنمنٹ نے برپا کیا، حکم جاری کر دیا گیا کہ تمام سرکاری اسکولوں میں لازمی طریقے پر وندے ماترم پڑھوایا جائے، حضرت مولانا نے بیان جاری کیا کہ ''اگر حکومت سرکاری اسکولوں میں مسلمان بچوں، بچیوں کو وندے ماترم پڑھنے پر مجبور کرے گی تو ہم مسلمانوں کو مشورہ دیں گے کہ وہ اپنے بچوں کو اسکولوں سے اٹھالیں'' اس بیان کا چھپنا تھا کہ حکومت کی پیشانی عرق آلود ہوگئی، اور حکم نامہ واپس لے لیا گیا۔

حضرت مولانا کی ایک بڑی خوبی اعتدال پسندی تھی، وہ کسی بھی چیز میں سختی اور تشدد کا راستہ نہیں اپناتے تھے، مزاجاً بڑے سلیم الطبع تھے، بحث وتکرار، افتراق اور انتشار سے کوسوں دور تھے، تحزب، تعصب یا گروہ بندی سے طبعی طور پر متنفر تھے، انہوں نے پوری زندگی اتحاد بین المسلمین کی دعوت دی، مختلف طبقات اور مسالک کے درمیان پیدا ہونے والی خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی، وہ عالمی منظر نامے پر نظر رکھتے تھے؛ اس لیے اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ مسلمانوں کو آپسی انتشار میں مبتلا کرنا اور رکھنا صہیونی ایجنڈا ہے، اور اسلام دشمن طاقت کے لیے بڑا مؤثر اور مضبوط ہتھیار!

حضرت مولانا ذاتی زندگی میں بھی دوسروں کا بڑا خیال رکھنے والے تھے، انہوں نے زندگی کے شب وروز اس احتیاط کے ساتھ گزارے کہ ان کے قلم یا قدم سے کسی کا دل نہ دکھے، کسی کی عزت نفس پر حرف نہ آئے، کسی کی حوصلہ شکنی نہ ہو، اور اختلاف کے مرحلہ میں بھی تحقیر وتذلیل کا دروازہ نہ کھلے، دین کی آڑ لے کر دوسروں کی پگڑی اچھالنے اور اختلافی معاملات کو بہانہ بنا کر اپنے جذبہ انانیت کو تسکین دینے کی ''خطرناک ادا'' سے وہ بہت دور تھے، کہنے اور لکھنے کو یہ بات بڑی آسان ہے؛ مگر دل پر ہاتھ رکھ کر سوچئے تو محسوس ہوگا کہ عمل کے میدان میں اس کسوٹی پر کھرا اترنے والے کم ہیں، بہت ہی کم!

عالم عرب کی سب سے بڑی تنظیم اخوان المسلمین کے بانی اور روح رواں شیخ حسن البناء شہید اعلی اللہ مراتبہ سے کسی نے دریافت کیا: آپ اتنی بڑی تحریک کے سرخیل اور امام ہیں، علم وفضل اور فکر ونظر میں ممتاز ہیں، اس کے

باوجود کتابیں تصنیف نہیں کرتے، اس کی کیا وجہ ہے؟ انہوں نے اس کا بڑا خوبصورت جواب دیا: ''اصنف رجالا وھم یصنفون الکتب'' میں افراد تیار کرتا ہوں اور وہ کتابیں تصنیف کرتے ہیں، کوئی شبہ نہیں کہ شیخ نے بڑے قیمتی افراد تیار کیے جنہوں نے راہِ دین میں جان و مال کا سرمایہ لٹایا، قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، اولاد کی جدائی کا دکھ سہا، قتل وخوں کے دریا سے گزرے اور ''الـمَـوتُ فـي سبيل الله اقصیٰ امانينا'' کا نعرہ بلند کرتے ہوئے تختہ دار پر چڑھ گئے، نہ دبے، نہ جھکے، نہ پیچھے ہٹے، مصائب کی سرکش موجوں کے درمیان، مشکلات کے منہ زور طوفانوں کے بالمقابل، خوں آشام تلواروں اور سنگینوں کے سایہ میں وہ یہی پکارتے رہے کہ ''هٰـذا مَـا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُولُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُولُهٗ'' (یہ وہی چیز جس کا ہم سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے وعدہ کیا تھا اور سچ ہے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا وعدہ) اور ہاتف غیبی بھی اُن کے جذبۂ ایمان ویقین پر مہر تصدیق ثبت کرتا رہا کہ ''وَمَـا زَادَهُم اِلَّا اِيمَانًا وَّتَسلِيمًا'' افرادسازی بڑا کارنامہ ہے، مردم گری بڑی نعمت ہے، مگر یہ دولت خال خال کسی کو ملتی ہے، حضرت مولانا کا شمار بھی ان ہی کمیاب لوگوں میں ہے، انہوں نے صرف کتابیں نہیں لکھیں، ملت کے لیے بڑے قیمتی افراد اور ہر محاذ پر کام آنے والے باہمت اور جواں مرد سپاہی بھی تیار کیے، حضرت مولانا کے زیر سایہ پروان چڑھنے والے افراد میں سب سے ممتاز اور نمایاں شخصیت قافلہ سالار ملت حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی اطال اللہ بقاءہ کی ہے، مولانا محترم اپنے ماموں جان کی خوبیوں اور صفات کے امین اور ان کے صحیح اور سچے جانشین ہیں، علم وحلم، اعتدال وتوازن، فکرمندی ودرد مندی، تواضع وعبدیت، اخلاص واستقامت اور زہد وتقویٰ میں بے نظیر اور بے مثال! ع

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

گزرے ہوئے ستمبر میں بھوپال میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ تھی، میٹنگ کے اگلے دن بورڈ کے جنرل سکریٹری امیر شریعت حضرت مولانا محمد ولی رحمانی زید مجدھم حضرت مولانا رابع صاحب سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے، عاجز راقم الحروف ساتھ تھا، حضرت مولانا عمران خان بھوپالی رحمۃ اللہ علیہ کے دولت کدے پر تفصیلی ملاقات ہوئی، وہاں سے نکلے تو راستے میں دیر تک حضرت امیر شریعت مدظلہٗ خاموش رہے، پھر فرمایا: ''میری جوانی کے دور میں بڑے بڑے علماء تھے، ملک وملت کی قیادت کرنے والے، زبان وقلم پر غیر معمولی دسترس رکھنے والے، پھر سب ایک ایک کر کے رخصت ہوگئے، اب ہمارے بڑے مولانا رابع صاحب ہیں، کیسے وضع دار انسان ہیں، تعلقات کو نباہنے والے، شرافت کے پیکر، اعتدال وتوازن کے خوگر! اللہ انہیں دیر تک سلامت رکھے کہ دور دور تک ایسا بے لوث انسان نظر نہیں آتا'' حضرت امیر شریعت نے نہ

جانے دل کی کس گہرائی سے یہ جملے کہے تھے کہ اس نامۂ سیاہ کی آنکھیں نم ہوگئیں، اور بے اختیار دل سے دعا نکلی کہ خداوندا! تیرے ایک مقبول بندے کی دعا تیرے ایک پاکیزہ بندے کے حق میں قبول فرما!

حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی زید مجدھم کے علاوہ حضرت مولانا سے استفادہ کرنے اور ان کے فکر ونظر سے خوشہ چینی کرنے والوں کی ایک لانبی فہرست ہے، کچھ ان میں سے اللہ کو پیارے ہوگئے، جیسے مولانا معین اللہ ندوی رحمۃ اللہ علیہ سابق نائب ناظم ندوۃ العلماء، مولانا مجیب اللہ ندویؒ مدیر الرشاد، مولانا عبداللہ عباس ندویؒ اور مولانا محمد الحسنیؒ، آخر الذکر حضرت مولانا سے قریبی نسبی تعلق رکھتے تھے اور عربی انشاء وادب میں امتیازی شان و مقام بھی! کم عمری میں وفات پاگئے، زندہ رہتے تو بڑا نام پیدا کرتے اور ملت اسلامیہ کی رہبری کا فرض انجام دیتے، مگر اللہ کا فیصلہ نافذ ہوا، اور حضرت مولانا کی حیات ہی میں مولانا محمد الحسنیؒ رخصت ہوگئے، حضرت مولانا کے جو تلامذہ اور مستفیدین موجود ہیں وہ اپنے اپنے دائرے میں بڑی گراں قدر خدمت انجام دے رہے ہیں، مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوۃ العلماء کا منصب اہتمام سنبھالے ہوئے ہیں، مولانا تقی الدین ندوی زید مجدہٗ حدیث شریف کی خدمت میں ہمہ تن مشغول ہیں، مولانا واضح رشید ندوی صاحب کا قلم اسلام کی فکری سرحدوں کی حفاظت کررہا ہے، مولانا سلمان حسینی ندوی کی پرجوش تقریروں سے ایوان باطل میں لرزہ ہے، مولانا خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی ندوی شب و روز اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے لیے کوشاں ہیں، مولانا نذر الحفیظ ندوی ازہری طالبان علوم نبوت کو سیراب کررہے ہیں، مولانا بلال حسنی ندوی تحریک پیام انسانیت کو آگے بڑھانے کے لیے مصروف عمل ہیں، مولانا الیاس ندوی بھٹکلی کی زبان اور ان کا قلم خدمت دین کے لیے وقف ہے، اور یہ تو صرف ہمارے ملک کی بات ہے، بیرون ممالک میں کہاں کہاں حضرت مولانا کے تلامذہ اور ان کے فکر ونظر کے خوشہ چین علوم وفنون کی اشاعت اور دین وشریعت کی خدمت میں مشغول ہیں، ان کا احاطہ اس مضمون میں دشوار ہے۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ ''رجل صالح'' تھے اور قرآن میں ایمان اور عمل صالح سے جڑنے والے انسانوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَانُ وُدًّا﴾ (عنقریب اللہ پاک ان کے لیے دلوں میں محبت ڈال دے گا) انسانوں کے دل اللہ کی مٹھی میں ہیں، وہ جدھر چاہتا ہے دلوں کو پھیر دیتا ہے، جب انسان اللہ پاک کی بتائی ہوئی راہ پر چلتا ہے، پاکیزگی اور تقویٰ کا راستہ اختیار کرتا ہے، ذکر وفکر اور طاعت و عبادت سے جُڑ جاتا ہے تو پھر اللہ پاک اس کے لیے دلوں میں گنجائش پیدا کردیتا ہے، لوگ اسے ٹوٹ کر چاہتے ہیں، اور خدا کے برگزیدہ انسان سے عقیدت ومحبت کا رشتہ استوار کرتے ہیں، دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اہل اللہ اور بزرگان دین عزت وعظمت اور مقبولیت کے اس مقام تک پہونچے، جہاں تک شاہان مملکت اور سربراہان

سلطنت بھی نہ پہونچ سکے۔عبداللہ ابن مبارکؒ نے بغداد کا رخ کیا تو پورا شہران کے استقبال کے لیے امڈ پڑا،لوگ دیوانہ وار ایک دوسرے پر گرتے تھے،اور جب ابن مبارکؒ کو چھینک آئی اور انہوں نے الحمدللہ کہا تو یرحمکَ اللہ کی آواز سے شہر گونج اٹھا،محل کے جھروکے سے یہ منظر دیکھنے والی ملکہ پکار اٹھی ''واللہ! بادشاہت تو یہ ہے!'' عزالدین ابن عبدالسلامؒ برسر اقتدار طبقے سے ایک شرعی مسئلے میں اختلاف کی وجہ سے شہر چھوڑ کر جانے لگے تو شہر کے باشندے بھی شہر چھوڑ کر نکل آئے کہ اگر حضرت جارہے ہیں تو ہم بھی یہاں نہیں رہیں گے،امام احمد ابن حنبلؒ نے اپنے دور کے حکمرانوں سے خلق قرآن کے مسئلے میں اختلاف کیا،قید و بند کے مرحلوں سے گزرے،اور جب اس دنیا سے رخصت ہوئے تو کم وبیش ۱۳/لاکھ انسانوں نے ان کے جنازے کو کاندھا دیا،یہود و نصاریٰ کی ایک بڑی تعداد نے ان کے جنازے کو دیکھ کر اسلام قبول کیا،اور بادشاہ وقت نے ان کی تجہیز و تدفین میں حصہ لیا۔

یہ چند مثالیں بتاتی ہیں کہ اہل اللہ کو عظمت و شوکت، ہیبت و عظمت اور رعب و دبدبے سے نوازا جاتا ہے، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ بھی خاصان خدا میں سے تھے،عرب و عجم میں انہیں مقبولیت ملی،محبوبیت کے بڑے اونچے مقام پر وہ فائز ہوئے،لکھنؤ کی سڑکوں پر سائیکل رکشا چلانے والے غریب اور مفلس انسان کے دل میں اگر ان کی عظمت تھی تو سعودی عرب کے بادشاہ شاہ فیصل اور اردن کے حکمراں شاہ عبداللہ دل سے ان کی قدر کرتے تھے،فرق اتنا سا تھا کہ لکھنؤ کے غریب رکشا چلانے والے کے لیے وہ ''بڑے مولانا'' تھے،اور بادشاہانِ عرب کے لیے ''**الداعية الكبير**'' اور ''**العالم الرباني**''!مقبولیت کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ اہل ایمان کے علاوہ ملک کے غیر مسلم بھائیوں کا ایک بڑا طبقہ بھی انہیں محبت اور قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور ملک کا محسن اور بہی خواہ خیال کرتا تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کے وصال پر کعبہ و بت خانہ دونوں سے صدائے نالہ وشیون بلند ہوئی اور ملک کے وزیر اعظم سے لے کر ریڑھی کھینچنے والے مزدور تک نے محسوس کیا کہ آج ایک بڑا انسان رخصت ہوا،ایک عظیم ہستی نے داغ مفارقت دیا،ملک کا خیر خواہ اور انسانیت کا ہمدرد چل بسا!۔

چھپ گئے ساز ہستی چھیڑ کر
اب تو بس آواز ہی آواز ہے

خلق کے یہاں مقبولیت ہو اور خالق کے یہاں عدم مقبولیت،تو یہ گھاٹے کا سودا ہے،اور سراسر نقصان و خسران! حضرت مولانا خلق کے چہیتے بھی تھے اور خالق کی بارگاہ میں مقبول بھی! اسی لیے انہوں نے سعادت کی زندگی پائی اور قابل رشک موت! کس ادائے دلبرانہ اور شان عاشقانہ کے ساتھ وہ دنیا سے رخصت ہوئے،رمضان المبارک کے آخری عشرے میں، جمعہ کے مبارک دن پاک پروردگار کے پاک کلام کی تلاوت

کرتے ہوئے، مغفرت اور اجرِ عظیم کی بشارت پا کر!۔

قسمت نگر کہ کشتہ شمشیر عشق یافت
مرگے کہ زاہداں بدعا آرزو کنند

حضرت مولانا تو چلے گئے مگر اپنے نقوش قدم چھوڑ گئے، ان کے افکار و خیالات آج بھی مشعل ہدایت اور مینارۂ نور ہیں، ان کی زندگی کے سوانح اور حالات سبق آموز اور ایمان افروز ہیں، ان کی کتابیں اور تصنیفات سرمۂ نگاہ و نظر ہیں، اور ان کی تقریریں اور خطبات سرمایہ دین و دانش ہیں، جن میں زمانہ و زندگی کے چیلنجز سے عہدہ برآ ہونے کی تدبیریں ہیں اور شرف و شعور کی بلندیاں حاصل کرنے کی مؤثر ترکیبیں!

زمانہ و زندگی کا سفر جاری ہے اور ''آسیائے گردشِ ایام'' رواں دواں، دن جیسے جیسے بیتتے جا رہے ہیں، حضرت مولانا کے فکر و نظر کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے، اور ان کی کمی کا احساس بھی دن بدن بڑھتا جا رہا ہے، ملک کے ان مشکل حالات میں اور مصائب و مشکلات کے سیلاب بلاخیز میں بار بار اس قائد و مفکر کی یاد آتی ہے، جس نے زخم کھا کر، مصیبت سہ کر، مشقت برداشت کر کے ملک و ملت کی تعمیر و ترقی کا عظیم کارنامہ انجام دیا اور اسلاف کی روایتوں اور قدروں کی یاد تازہ کر دی۔

وہ تو طائف کے مبلغ کا فدائی تھا اثر
کھا کے پتھر جو زمانے کو گل تر دے گیا

اللہ تعالیٰ حضرت مرحوم کے درجات بلند کرے اور انہیں اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔
آمین یارب العالمین!